
شبو
رضیہ بٹ

شبو

رضیہ بٹ

احسن برادرز المینار مارکیٹ لاہور

بھاری پلو والی بنارسی ساڑھی سرخ تھی نہ گلابی —— ساڑھی نئی بھی تھی اور
چمکیلی بھی۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی۔ یہ نیا پن ماند ماند سا نظر آ رہا تھا۔ یہ جیول
کی رنگت اڑی اڑی سی دکھائی دے رہی تھی۔ کار کی چھت سے چپکے ہوئے
چھوٹے سے قمقمے کی ہلکی ہلکی روشنی میں ساڑھی کا یہ رنگ نگاہوں کو ایسا
تاثر دے رہا تھا۔ سرخ اور گلابی رنگت کے بین بین ہو سکتا ہے اس رنگت
کا کوئی اور ہی نام ہو۔ لیکن اس وقت رنگ کی انفرادیت کسی نام کی قید میں نہ آ
رہی تھی۔

ساڑھی میں لپٹا ہوا حسین و متناسب جسم نڈھال اور بے جان سا
نظر آ رہا تھا۔ چوبیس سالہ شبّو کا جھکا ہوا چہرہ تزئین و آرائش سے خوبصورت
تو لگ رہا تھا لیکن اس پر اداسیوں کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔
موٹر کی پچھلی سیٹ پر دو نوجوان عورتوں میں گھری، سر جھکائے بیٹھی
شبّو دلہن تو تھی لیکن اس پر دلہن ہونے کا قطعاً گمان نہ ہوتا تھا۔

اس نے بیش قیمت زیورات پہن رکھے تھے۔
اس نے قیمتی ساڑھی بھی زیب تن کی تھی۔
وہ جسم کو سکیڑے ہوئے سمٹے ہوئے بھی تھی۔
اس نے سر جھکا کر آنکھیں بھی نیچی کر رکھی تھیں۔
لیکن

ان سب روایتی نشانیوں کے باوجود وہ دلہن نہ لگ رہی تھی۔
اس کے چہرے پر جذبات کی جگمگاہٹ نہ تھی۔
اس کی آنکھوں میں خوابوں کی دھند نہ تھی۔
بجھتے چراغ سے اٹھتے دھوئیں کی لپٹیں ہی لپٹیں نظر آ رہی تھیں۔
غبار سا پھیل رہا تھا۔

غبار

جس نے اس کی زندگی کی حرارت تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
کسی آنے والے خدشے
کسی بیتتے ہوئے حادثے سے وہ سہمی جا رہی تھی۔

اور

ساڑھی کی عجیب و غریب رنگت اس کے سہمے ہوئے چہرے کی گمبھیر اداسیوں کو اور گہرا کر رہی تھی۔

اگلی سیٹ پر اس کا پچاس سالہ بھاری بھرکم شوہر نواز بڑی لاپروائی سے پائپ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ مڑ کر جھکی جھکی شبو کی طرف

مسکرا کر دیکھ لیتا لیکن نواز کی جہاندیدہ مسکراہٹ بجھتے چراغ میں روشنی کی رمق تھرتھرانے کا باعث نہ بن سکتی۔

شبو اور نواز کی آج ہی شادی ہوئی تھی۔ اپنے دوست کے ہاں نکاح کی تقریب ادا کرنے کے بعد وہ اپنی نئی دلہن کو دوسرے شہر اپنے گھر لے جا رہا تھا۔ اسے ایک سوشل بیوی کی ضرورت تھی۔ پہلی بیوی بچے پیدا کرنے والی مشین تھی۔ جس کا حسن جوانی اور صحت سب کچھ بچوں کی نذر ہو چکا تھا۔ اس کی مسلسل بیماری کا بہانہ کارگر ثابت ہوا۔ اور نواز چوبیس سالہ شبو کو دلہن بنا لایا۔ دولت میں روز افزوں اضافے اور سوسائٹی میں اونچے مقام نے سوشل اور جوان بیوی کی ضرورت کو شدید کر دیا تھا۔ اپنے دوست اسحاق کی وساطت سے وہ اس ضرورت کو پورا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

یہ شادی کسی ہنگامی حادثے کا نتیجہ نہ تھی۔ نہ ہی شبو کی رضا و رغبت کے بغیر انجام پائی تھی۔

لیکن

آج

جب نکاح کی تقریب ادا ہو گئی۔

تو

شبو کے محسوسات پر جیسے منجمد برودت چھا گئی۔

تین گھنٹے کی مسافت کے بعد جب موٹر نواز کی خوبصورت کوٹھی میں داخل ہوئی تو شبو کا دل جیسے رک سا گیا۔ وحشت زدہ نظروں سے اس

نے گرد و پیش دیکھا۔

"آ گیا تمھارا گھر" چمکیلی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے حامدہ نے شبو کے کان میں سرگوشی کی۔

"میرا گھر" شبو زیر لب مسکرا کر بڑبڑائی۔ اس نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ سر ہاتھوں پر ٹکا کر وہ کچھ اور جھک گئی۔

موٹر پورچ میں رکی —— تیز برقی روشنی میں ہر چیز جگمگا رہی تھی۔ ہارن کی آواز سن کر کئی عورتیں مرد اور بچے ڈرائینگ روم سے نکل کر برآمدے میں آ گئے تھے۔

نواز موٹر سے باہر آیا —— جانے کس کس نے مبارک باد کہی۔ وہ مسکراتا ہوا پچھلی طرف آیا۔ موٹر جھلملاتے لباس والی کئی عورتوں اور بچوں کے گھیرے میں تھی۔ ہر کوئی دلہن کو دیکھنے کے لیے بیتاب سا نظر آ رہا تھا۔

"اٹھو بھابی" ساتھ بیٹھی کرن بولی۔

شبو مٹی کے بے جان تودے کی طرح سیٹ پر پڑی تھی۔

"کرن" حامدہ بولی۔

"جی"

"ذرا ادھر سے پہلے تم باہر نکلو —— پھر دلہن ——"

"اچھا" کہتے ہوئے کرن دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

"کیسی ہے دلہن" کئی عورتوں نے استفسار کیا۔

"بہت حسین۔ ابھی دیکھ لیجئے گا" کرن مسکراتے ہوئے پلٹی۔

دروازہ کھول کر اس نے شبو کو باہر آنے کے لیے کہا۔

"چلو اٹھو نا ——" حامدہ نے پیار سے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالا، کرن نے ہاتھ کا سہارا دیا۔ شبو باہر نکل آئی۔

دلہن کا استقبال مسکراتے چہروں نے کیا۔ ہاں کچھ چہروں کی مسکراہٹ شبو کی ساڑھی کی طرح ماند ماند سی تھی۔

عورتوں اور بچوں میں گھری وہ ڈرائینگ روم میں آ گئی۔

طویل و عریض جدید طرز کا ڈرائینگ روم برقی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

شبو کو ایک نرم و گداز صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ عورتوں، مردوں اور بچوں نے اسے گھیر لیا۔

کچھ باتیں، کچھ ہنسیاں، کچھ تبصرے، کچھ سرگوشیاں فضا کا سکوت توڑنے لگیں۔

بجھتے چراغ کا دھواں اور تیزی سے اٹھنے لگا۔ شبو کی نظروں کی وحشت اور چہرے کی اداسی اور بڑھ گئی۔ بڑی کوشش سے وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

عورتوں نے اسے گھیر لیا۔

اس سرد شعلے کو تنقیدی نظروں سے دیکھا پرکھا جانے لگا۔

کسی نے چمکتی ہوئی طلائی انگشتریوں کی گرفت میں آئی ہوئی گداز انگلیوں کو تھام لیا۔

کسی نے سڈول کلائیوں پہ کھنکتی چوڑیوں پہ ہاتھ رکھا کسی نے جگمگاتے آویزوں کا عکس چہرے پر دیکھنے کی کوشش کی۔ کسی حقیقت پسند نے ان ظاہری آرائشی و زیبائشی چیزوں سے ہٹ کر اس کے چہرے پہ مسکراہٹوں کا پرتو دیکھنے کی سعی کی لیکن سپاٹ چہرہ دیکھ کر بڑی اپنائیت سے اس کے کان میں کہا:

"ذرا تو مسکراؤ۔ ایسی بھی کیا سنجیدگی — دلہن ذرا مسکراتی اچھی لگتی ہے۔

"دلہن" جیسے اس حقیقت پسند نے تیز دھار کا خنجر اس کے سینے میں چبھو دیا۔ وہ بے قرار ہو کر تڑپی۔ اس کا جھکا ہوا سر کچھ اور جھک گیا۔

اس جھکاؤ کو دلہن کی فطری شرم پر محمول کیا گیا۔ نوعمر لڑکیاں اور نوجوان عورتیں اس حیا بار ادا سے خاصی محظوظ ہوئیں۔ لیکن ادھیڑ عمر ساجدہ کو حیا کا یہ مظاہرہ غیر فطری سا لگا۔ یوں بھی نواز کی بیوی رشتہ میں بہن تھی۔ بشیر اس کے محسوسات پر چوٹ تھی۔ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے تیزی سے بولی:

"شرما تو یوں رہی ہے۔ جیسے آج پہلی بار دلہن بنی ہو"

اُف

اس کا چکراتا ہوا دماغ پھٹ جانے کو تھا۔

یہ جملہ نہ تھا۔

بم تھا۔

جس نے اس کے محسوسات کے پرخچے اڑا دیے۔ اس کے سینے

میں طوفان خیز قیامتیں مچل گئیں۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی ہر کوشش نے دم توڑ دیا۔ کمرے کی چیزیں گھومنے لگیں۔ اک شور سا کانوں سے ٹکرانے لگا

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

چیزوں کا گھماؤ رکا نہیں — شور تیز ہوتا گیا۔ اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں — لیکن زہریلا جملہ اپنا اثر کر چکا تھا۔ ایک ایک چیز گھومتے ہوئے اس کا منہ چڑا چڑا کر کہہ رہی تھی "جیسے آج پہلی بار دلہن بنی ہو۔ جیسے آج پہلی بار دلہن بنی ہو —"!

"نہیں — نہیں! —" وہ بے بس ہو کر چیخی — بے دم ہو کر سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا — "میں پانچ سال پہلے — پانچ سال پہلے بھی دلہن بنی تھی — دلہن بنی تھی — پانچ سال پہلے —" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

گرد بیٹھی عورتیں اس بڑبڑاہٹ سے کچھ نہ سمجھ سکیں لیکن اس کی حالت غیر ہوتے دیکھ کر گھبرا ضرور گئیں — سب ساجدہ بیگم کو گھور گھور کر دیکھنے لگیں۔

شبو کی طبیعت یوں خراب ہونے دیکھ کر کرن اور حامدہ اسے وہاں
سے اٹھا کر خواب گاہ میں لے آئیں۔

نئی طرز کی یہ خواب گاہ بڑے سلیقے سے آراستہ تھی۔ دروازوں
اور چوڑے دریچوں پر ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔ قالین نے پورے
فرش کو ڈھانپ رکھا تھا۔ فوم ربڑ کے گدے والا اسپرنگ دار پلنگ کمرے
کے وسط سے ذرا ہٹ کر پڑا تھا۔ لچکیلے گدوں والی دو کرسیاں بھی تھیں۔
بڑے سے آئینے والی سنگار میز بھی تھی۔ اور مشرقی کونے میں کمرے
کی مناسبت سے ہلکے سبز رنگ کی الماری بھی پڑی تھی۔ ہلکی ہلکی سبز روشنی
سے کمرے کی فضا خواب ناک سی تھی۔

"بیٹھو شبو ۔۔۔" کرن نے بڑے پیار سے اسے پلنگ پر
بٹھا دیا۔ فوم ربڑ کا گدا اچکا۔ اسپرنگ کے اضطرابی لوچ سے مدھم سی صدا
ابھری۔ شبو نے بے قرار ہو کر کرن کی طرف دیکھا۔

کرن مسکرا دی۔

"صبح سے سکڑی سمٹی بیٹھی تھیں نا۔ تکان سے طبیعت خراب ہو
گئی ۔۔۔" حامدہ نے جیسے ساجدہ کی بات پر پردہ ڈالنا چاہا۔

"تین گھنٹے کا سفر بھی تو کچھ کم نہیں تھا ۔۔۔ میرا اپنا جسم درد کر رہا
ہے۔" کرن نے کہا۔

"لیٹ جاؤ ۔۔۔" حامدہ نے شبو سے کہا ۔۔۔ "کچھ دیر آرام کرو
پھر ۔۔۔"

حامدہ اور کرن ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرا دیں۔
شبو کے سینے کی ہلچل سے وہ واقف بھی کہاں تھیں۔
دونوں ہنسی مذاق کرتیں کمرے سے نکل گئیں۔
شبو تنہا رہ گئی۔

یہ تنہائی اسے سکون نہ دے سکی۔ اذیت کے لمحات شدید سے شدید تر
ہوتے گئے۔ ضمیر جاگ اٹھا اور حواس مختل ہونے لگے۔
اس نے سر ہاتھوں پر گرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کے سامنے
لال پیلے دھبے ناچنے لگے۔

وہ ان رنگ برنگی دھبوں کو پھیلتے سکڑتے دیکھنے لگی۔
وہ دیکھتی رہی ۔۔۔ دیکھتی رہی۔
لال پیلے دھبے پھیلتے سکڑتے رہے۔

اور

پھر

یہ لال پیلے دھبے سُرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی شرمیلی سی دلہن کے پیکر میں ڈھل گئے۔

پلنگ پر تکیے کے سہارے بیٹھی دلہن حیا کے بار سے جھکی جا رہی تھی۔ ساٹن کے سُرخ سُوٹ پر گوٹے کے سفید سفید ٹکلے سو پاور کے بلب کے نیچے جگمگا رہے تھے۔ لانبی لانبی کرن والا لال دوپٹہ بھی گوٹے سے بھرا تھا۔ پلنگ کا چوتھائی حصہ دوپٹے کے پھیلاؤ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ گھٹنوں پر سر رکھے آنکھیں بند کیے وہ سہانی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔

سہانی دنیا۔

جس کا تصوّر اس کے رگ و پے میں نشاط انگیز چنگاریاں سُلگا رہا تھا۔ ہر جوان لڑکی کی طرح اس نے بھی سپنوں کے جال بُنے تھے۔ اک حسین اجنبی شہزادے کو ان سپنوں کی چہل پہل میں بسایا تھا۔ آج سپنے حقیقت کے پیکر میں ڈھل گئے تھے۔ اجنبی شہزادے نے وسیم کا روپ دھار لیا تھا۔

قدموں کی آہٹ پر اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہ انجانے شہزادے کی آمد پر خوشی کا پہلا تاثر تھا۔

پچیس سالہ وسیم نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ ساٹن کے گہرے سبز رنگ کا پردہ ٹھیک کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا

رہے تھے۔ خوبصورت آنکھوں میں سرخی کی جھلک تھی۔ بن پئے مدہوشی کی سی کیفیت تھی۔ قدم بہکے بہکے سے تھے۔

لانبے قد اور مضبوط جسم والا خوبرو وسیم جذبات کی ہلچل سے کچھ گھبراہٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ اسی گھبراہٹ کو چھپانے کے لیے وہ ٹھیک ٹھاک پڑے کو خواہ مخواہ درست کر رہا تھا۔

دروازے کے قریب کھڑے اس نے سرخ کپڑوں میں لپٹی اس مقدس امانت کو دیکھا۔

شوق و تجسس بے تاب ہو گئے۔

وہ دھیرے دھیرے بڑھا۔ دلہن شرما کر اور سمٹ گئی —— اس نے اپنے کندھے پر ایک بھاری ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ اس کا کنوارہ جسم اس لمس سے کپکپا اٹھا۔ وہ کچھ اور جھک گئی۔ اور بازوؤں کا حلقہ کچھ اور تنگ ہو گیا۔

وسیم کی ہمت بندھی۔ پلنگ کے کنارے بیٹھتے ہوئے اس نے آہستگی سے پکارا۔

"شبّو ——"

شبّو کے تصور میں یہ آواز بار بار گونجی تھی۔ لیکن آج اس آواز کی لطافت میں وہ کھو کر رہ گئی۔

وہی جذبات سے مغلوب آواز کئی بار گونجی —— شبّو آنکھیں بند کئے اس آواز کی نغمگی میں ڈوبتی گئی ——

شوق و تجسس کی بے تابی بے باکی میں ڈھل گئی — مضبوط مردانہ
ہاتھوں کا مقابلہ شبو کے نرم و نازک ہاتھ کہاں تک کر پاتے — سانس
بھی پھولی اور کانچ کی سُرخ سُرخ چُوڑیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ لیکن گھونگٹ اُلٹ
ہی گیا۔

شبو کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ اس کی ملامت اور جاذبیت
میں ڈوب گیا۔

شبو نے بھی پہلی بار جھکی جھکی کانپتی نگاہوں سے خوابوں میں ایک
عرصہ سے بسنے والے اجنبی کو دیکھا۔ چوڑی پیشانی پر اُلجھی سلجھی لٹیں اور
گہری گہری مخمور آنکھوں والا وسیم نگاہوں میں سمایا اور دل میں اُتر گیا لطف و
انبساط کی اک شگفتہ سی لہر اس کے انگ انگ میں دوڑ گئی۔

سہاگ رات کے حسین مراحل طے ہوتے رہے۔ دوریاں مٹ گئیں،
اجنبیت ختم ہو گئی۔ دو دل ایک ساتھ دھڑکے۔ دو زندگیاں اک نئے راستے
پہ چلنے کے لیے متحد ہو گئیں۔

نئی زندگی کا آغاز کتنا حسین تھا۔

شبو نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں —

سر کو جھٹکا — آنکھیں ملیں۔

ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

وہ چھوٹا سا غیر آراستہ کمرہ — وہ لال لال اینٹوں والا ننگا
فرش — وہ لکڑی کا سادہ سی چارپائی نما پلنگ — وہ کھڑکی اور دروازے

پر لٹکتے ہوئے کاٹن کے گہرے سبز رنگ کے پردے۔

اور

اور وہ حسین پیشانی پر اُلجھی سلجھی لٹیں — اور مخمور آنکھوں والا وسیم
— کہاں تھے — سب کہاں تھے —!

وہ آنکھیں پھاڑے اس نئی طرز کے سلیقے سے آراستہ خوابگاہ
کی قیمتی چیزوں کو دیکھنے لگی —

اس پر مجنونانہ سی کیفیت طاری ہو گئی۔ چند لمحے وہ اسی انداز میں
بیٹھی چیزوں کو گھورتی رہی — اس کا سانس تیز ہو گیا — وہ ہانپنے
لگی — اس نے سر تھام لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔

جذبات کے تھپیڑے کھاتے ہوئے وہ ماضی کے بھنوروں میں
بُری طرح پھنس گئی تھی۔

اس نے سر کو زور زور سے جھٹکا۔

آنکھیں کھول کھول کر دیکھا۔

آنکھیں بند کر کے سوچا۔

اپنے کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔ ماضی کی سلگتی چنگاریوں
کو راکھ تلے دبا دینے کی اک عزم سے کوشش کی — تڑپتی یادوں کے
بہلاوے کے لیے ماحول کے حسن کو نگاہوں میں جذب کرنے کی کوشش
کرنے لگی۔

اس نے اپنے زیور سے لدے جسم پر نظر ڈالی — چمکتی طلائی چوڑیوں

پر ہاتھ پھیرا ـــــ آج اس کے ہاتھوں میں کانچ کی سُرخ سُرخ چوڑیاں نہ تھیں ـــــ ڈھیر سی طلائی چمکتی کھنکتی چوڑیاں تھیں۔ وہ بازوؤں کو ہلا ہلا کر ان چوڑیوں کی مسحور کُن آواز میں ماضی کی یادیں ڈبونے لگی۔

پھر

وہ

اٹھ کر کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ ہر چیز قیمتی تھی۔ ہر چیز حسین تھی۔ ہر چیز پُرکشش تھی۔

کتنا ارمان تھا اسے ان چیزوں کا

لیکن

آج سب کچھ پا کر بھی وہ تڑپ رہی تھی ـــــ ہر چیز جیسے تمسخر سے اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ بہلاوے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہو رہی تھی۔

گھبرا کر اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر پٹ کھول دیئے۔

باہر آسمان پر آج بھی چودھویں کا چاند اُبھر رہا تھا۔

وہی چودھویں کا چاند،

جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی پُرکیف چاندنی میں ـــــ سہاگ رات اس نے وسیم کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے اپنی ابدی وفا کا یقین دلایا تھا اس دن چاند مسکرایا تھا۔

اور

آج

آج اسے یوں لگا جیسے وہ چاند نہیں کسی دل کا گھاؤ ہو۔

وہ چاند کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر پانچ سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گئی۔ سہاگ رات کے لطیف لمحے اس کی یادوں میں ٹھہر گئے لگے۔

چودھویں کا چاند ماحول کو مسحور کیے ہوئے تھا۔ وسیم اسے سہارا دے کر کھڑکی تک لے آیا تھا۔ اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے۔

اور

پھر

ایک دوسرے کی قربت سے مغلوب دونوں نئی زندگی کی راہیں استوار کرنے لگے تھے۔

"آج ہم نئی زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں شبو ـــــ خدا کرے یہ نیا دور خوشیوں کا ضامن ہو ـــــ" وسیم نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر سرگوشی کی ـــــ "میرے خلوص و وفا میں تم کبھی کمی نہ پاؤ گی۔"

اور شبو نے اس محبت بھرے اقرار کے جواب میں اپنا سر اس کے کندھے سے لگا کر محجوب لیکن مستحکم آواز میں اپنی ابدی وفا کا یقین دلایا تھا۔

خوشی کے بھرپور احساس کے ساتھ وسیم نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ کر اپنے تپتے ہونٹ اس کی گردن پر رکھ دیے تھے۔

ہونٹوں کے گرم گرم لمس پر شبو نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ

گردن پہ رکھا ـــــ جانداری نمی محسوس کرکے وہ ایک دم پلٹی۔

اس کا نیا شوہر نواز پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

یہ لمس وسیم کے نہیں نواز کے ہونٹوں کا تھا۔

زلزلے کے شدید جھٹکے سے بھی پُرزور جھٹکا اس کے جذبات کو لگا ـــ اس کا رنگ فق ہوگیا۔ اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے آگئے۔

نواز سہارا دے کر اسے پلنگ تک لے گیا۔

اور وہ کسی سوکھے پیڑ کی ننگی شاخ کی طرح جو ذرا سے جھٹکے سے ٹوٹ گرے ـــ پلنگ پر گر گئی ۔

وسیم بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سہاگ اجڑنے کے بعد ماں نے وسیم ہی کو سہارا پایا تھا۔ اس سہارے کو تنومند بنانے کے لیے اس کی جوانی کا خون درکار تھا۔ اس کی امنگوں، ارمانوں اور تمناؤں کا نچوڑ چاہیئے تھا۔ ماں نے یہ سب کچھ بخوشی نچھاور کر دیا۔ بیٹے کی تربیت اس نے ناموافق حالات میں بھی پوری جانفشانی سے کی۔ وسیم نے ہوش سنبھالا۔ ماں کی انتھک محنت سے اس کا شعور بڑا متاثر ہوا ـــ اس کے مزاج میں سنجیدگی رچ بس جانے کی وجہ یہی تاثر تھا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے چہرے اس نے بڑے قریب سے دیکھے تھے۔ اس لیے اس کی زندگی تصنع، بناوٹ اور بے جا تکلفات سے بالکل پاک تھی۔

ماں کی طرح وسیم کی محنت بھی رائیگاں نہ گئی۔ اس نے امتیازی حیثیت سے بی اے پاس کر لیا۔ لیکن اس امتیازی حیثیت کے باوجود وہ کسی اعلیٰ شعبے میں ملازمت حاصل نہ کر سکا۔ وہ زندگی کے میدان میں تیز سے تیز دوڑ

گردن پر رکھا - ذہنی قابلیت کا مظاہرہ تو کر سکتا تھا لیکن اعلیٰ شعبوں
... ایسے جو زینے تھے - وہ اس کی دسترس سے دور تھے
...ں تھا نہ اثر و رسوخ --- پھر ان زینوں پر چڑھنے کی ہمت کہاں
سے لاتا --- !

اس نے زندگی کا رُخ موڑنے کے لیے ملازمت کر لی - تنخواہ
زیادہ تو نہ تھی - پھر بھی زندگی کو کسی ڈھنگ پر سلیقے سے لے آنے
کے لیے کافی تھی -

وسیم مایوس نہ تھا - اپنی قابلیت پہ اعتماد تھا - انتھک محنت کا
عادی تھا - اسے یقین تھا کہ وہ اعلیٰ شعبوں تک پہنچنے کے لیے اسی راہ
سے شاہراہ بنا لے گا -

دو تین سال میں وسیم کی قابلیت اور دیانت داری نے اسے ترقی
دلا دی -

وہ اب زندگی کی اہم ضروریات سے پوری طرح آنکھیں ملا سکتا
تھا - تنخواہ معقول تھی - کفایت شعار ماں نے کچھ پس انداز بھی کر لیا تھا - تین
کمروں اور چھوٹے سے صحن والا گھر جو ماں بیٹے کی حیات سے کشمکش کا
شاہد تھا - اب چھوٹی سی جنت بن گیا تھا -

ماں اس جنت کو آباد کرنے کی فکر میں رہنے لگی - پیاری پیاری بہو کا
تصور اسے بے چین رکھنے لگا - اکثر اس نے وسیم سے کہا - لیکن وہ ہنس
کر ماں کی بات ٹال جاتا -

"ابھی سے شادی کی کیوں فکر کرتی ہو ماں --- ابھی بھلی سکون سے
کٹ رہی ہے - یہ بہو کا جنجال ڈالو ہی نہیں تو اچھا ہے -"

"چل ہٹ بڑا آیا کہیں سے --- بہو ایسی لاؤں گی --- جو
اس گھر کو جنت بنا دے گی --- سکون ہی سکون ہو گا -"

"ماں اگر کوئی لڑاکا سی بہو پلّے پڑ گئی تو کیا کرو گی ؟" وہ ہنس دیتا
--- "دیکھو نا' اب تو ساری تنخواہ لا کر تمہارے حوالے کر دیتا ہوں - کل
کو بیوی آ گئی - تو وہ مانگا کرے گی تنخواہ --- میں اسے دوں گا نہیں - وہ
لڑا کرے گی - اور یہ گھر بس میدانِ جنگ بن جایا کرے گا --- توبہ ---
میں تو شادی کرنے کا نہیں -"

"بک بک نہ کر" ماں پیار سے ڈانٹ دیتی -

"ماں بڑی آرزو ہے میرے سہرے کے پھول دیکھنے کی ---"
وہ مذاق سے کہتا -

"یونہی ٹال مٹول کرتے رہے - تو میں تمہارے سہرے کے پھول
تو نہ دیکھ سکوں گی - البتہ تم میری میّت کے پھول ضرور دیکھ لو گے ---"

"ایسا نہ کہو ماں" وہ اس عظیم ہستی کے گلے میں پیار اور عقیدت
سے بانہیں ڈال دیتا --- "میرے سہرے کے کیا - تم نے تو ابھی میرے
بیٹوں کے سہروں کے پھول بھی دیکھنا ہیں ---"

"چل ہٹ" ماں ہنس دیتی -

وسیم اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے شادی سے گریزاں

تھا۔ ورنہ جہاں تک اس کی جوانی کا ت[illegible]نا تھا۔ وہ شادی کی ضرورت کو محسوس
کر رہا تھا۔

بڑی چھان بین کے بعد ماں نے اک رشتہ تلاش کر کے وسیم کو
شادی کے بندھن میں جکڑنے کے لیے ہموار کر ہی لیا۔

شبو ماں کا انتخاب تھی۔

متوسط الحال خاندان کی لڑکی کے لیے بھلا اس سے بہتر رشتہ کہاں
مل سکتا تھا۔ خوب صورت، خوب سیرت اور برسرِ روزگار لڑکا — اکیلا
گھر شبو کی خوش قسمتی کی دلیل تھی۔ چند رسمی باتوں کے بعد رشتہ منظور
کر لیا گیا۔

اور

پھر

شبو بہار کی نئی رُت کی طرح وسیم کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

سنسان اور غیر آباد جنت اس کی رعنائیوں سے رنگین ہو گئی —
وسیم کو تجرد کی خشک زندگی کے بعد حسین شبو کے معطر جلوے قدم قدم
پر لہراتے ملے۔ وہ ان جلووں میں کھو گیا۔ ان رعنائیوں میں ڈوب گیا۔ اپنا
پیار — اپنا خلوص اور اپنی عقیدت شبو پر نچھاور کرنے لگا۔

وسیم جیسا ساتھی پا کر شبو بھی سرشار تھی۔ وہ اس کی چاہت میں
ڈوب گئی۔

زندگی کا حسن نکھر آیا۔

اور

ماں نے جیسے زندگی کی رفعتوں کو پا لیا۔ بہو بیٹے پر تصدق ہو ہو جاتی۔
بیوگی کے بائیس سال حسرتوں کے مزاروں پر امیدوں کے چراغ جلاتے
گزار دیئے تھے — لیکن اب اپنی زندگی میں اس نے چراغوں کی جگمگاہٹ
دیکھ لی تھی۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ بارہا اس کا سر اظہارِ تشکر کے طور پر بارگاہِ ایزدی
میں جھک گیا۔

شبو نے جلد ہی گھر کے ماحول سے مطابقت کر لی۔ چھوٹی سی دنیا
کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے کر ساس کے تھکے ہارے وجود کو آرام و
آسائش کی ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی۔

شبو صرف محبوبہ ہی نہیں اک فرض شناس بیوی بھی تھی۔ وسیم دفتر
جانے کے لیے تیار ہوتا۔ وہ اک مشین کی طرح اس کا ہر کام کرتی۔ دلنواز
مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے محبوب ادائیں دکھاتے ہوئے وہ اسے تیار ہونے
میں مدد دیتی۔ ناشتہ کرواتی اور پھر دروازے تک چھوڑنے جاتی۔

وسیم کے جانے کے بعد وہ اس کے تصور میں کھوتی۔ گھر کے کام
کاج میں مصروف ہو جاتی۔ جہیز کا نیا سامان اس نے بڑی خوبصورتی سے
سجایا تھا۔ گھر کی رونقیں جاگ اٹھی تھیں — وہ ساس کو کوئی کام نہ کرنے
دیتی۔ برتن دھوتی۔ گھر صاف کرتی دوپہر کا کھانا بناتی۔ اور پھر سب کاموں
سے فارغ ہو کر صاف ستھرا لباس تبدیل کرتی۔ رنگین و حسین ملبوسات کا
اسے شروع ہی سے شوق تھا۔ بناؤ سنگار کی بھی شیدائی تھی۔ اسی لیے

مصروفیت کے باوجود وہ وقت نکال لیتی۔

اور

جب وسیم دن بھر کی دماغی کاوش سے تھکا تھکا گھر واپس لوٹتا تو صاف ستھرے گھر میں نکھری نکھری شبّو کے حسین جلوے ساری کلفتیں دور کر دیتے۔
کتنی حسین کروٹ لی تھی اس کی بےکیف اور روکھی پھیکی زندگی نے۔

وہ اکثر اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ کر اس کی حسین آنکھوں میں اپنی مخمور آنکھیں ڈال کر پوچھتا۔ "اتنی مدت کہاں تھیں تم شبّو ـــــ کتنی بےکیف تھی زندگی تمہارے بغیر ـــــ اب تو چاروں طرف بہار ہی بہار ہے۔"

اور شبّو محبوب ادا سے مسکرا کر اپنا سر اس کی چھاتی میں چھپا لیتی۔ شبّو کے انداز سپردگی سے اپنائیت کا احساس وسیم کے رگ و پے میں لطف و انبساط کی لہریں دوڑا دیتا۔

وہ لمحہ کتنا مسرور کن ہوتا!!

وسیم کی طبیعت صبح سے کچھ بوجھل سی تھی۔ شبّو پلنگ کی پٹی پر بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔ وسیم اک کیف آمیز غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر سے اس کا سر دبا رہی تھی۔ وسیم بھی فضا بدلنے کی تمنا شدت سے کر رہا تھا لیکن اسے شبّو کا بھی خیال تھا۔

"بس کرو شبّو ـــــ تھک گئے ہوں گے تمہارے ہاتھ" اس نے اپنے ہاتھ شبّو کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔

شبّو کی کھنکتی ہنسی پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"کیوں؟" اس نے مستفسرانہ شبّو کو دیکھا۔

"اتنے نازک تو نہیں ہیں میرے ہاتھ ـــــ جو ذرا دبانے سے تھک جائیں۔" وہ مسکرائی۔

وسیم نے گرم جوشی سے ان ہاتھوں کو دبایا ـــــ "نازک نہیں تو اور کیا ہیں۔"

اس نے بڑے پیار سے ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

وہ ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔

لیکن اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ شبو کے نرم و نازک ہاتھ اپنی خوب صورتی اور ملائمت کھو رہے تھے۔ گلابی پوریں کھردری ہو گئی تھیں۔ جا بجا چھری کی لکیریں پڑی تھیں۔ نرم نرم ہتھیلیوں پہ خراشیں راکھ کی ستم گری کے خلاف جیسے نوحہ خواں تھیں۔

"تین ماہ پہلے یہی ہاتھ کتنے ملائم تھے۔ جیسے ریشم کے لچھے۔

لیکن اب!

وسیم کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے بے چین ہو کر شبو کی طرف دیکھا۔

شبو کو یوں محسوس ہوا جیسے وسیم کی مخمور آنکھوں میں کانچ کے کئی پیمانے ایک ساتھ ٹوٹ گئے ہوں۔

"وہ بے چین ہو کر اس پر جھک گئی۔" کیوں؟ کیا ہوا؟"

تمہارے ہاتھوں کو کیا ہو گیا ہے شبو" وہ اداس آواز میں بولا

"کیوں؟"

"ان کا سارا حسن راکھ کی تہ تلے دب گیا ہے۔"

"کیا ہوا؟ گھر کا کام کرنا ہی ہوتا ہے" شبو کی آواز پھیکی سی تھی۔

"نہیں شبو یہ ہاتھ کام کرنے کے لیے نہیں ہیں"

"تو اور کس لیے ہیں؟" وہ ہنسی۔

"صرف بربط دل کے تار چھیڑنے کے لیے" اس نے شبو کے

ہاتھ سینے پر رکھ کر اپنے ہاتھوں سے دبائے۔

شبو ہنس دی۔

"ہنسو نہیں شبو — اب میں تمہیں کبھی ایسا کام نہ کرنے دوں گا جس سے یہ حسن ماند پڑ جائے۔"

"تو پھر کون کرے گا یہ کام —؟"

"کسی ملازمہ کا بندوبست کر لو۔"

"لیکن"

"خرچ بڑھ جائے گا یہی کہنے والی ہو نا؟ —"

"غلط تو نہیں یہ بات —"

"کسی نہ کسی طرح یہ گنجائش نکالنا ہی پڑے گی شبو — میں ان ہاتھوں کا حسن یوں لٹتے نہیں دیکھ سکتا —" اس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

شبو کا دل مسرت کے جذبے سے سرشار ہو گیا۔

وسیم کو اس کا کس قدر خیال تھا!

اپنی ماں کی وساطت سے شبو نے جلد ہی ملازمہ کا بندوبست کر لیا!

گھر کے کاموں میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو وسیم کی خوشنودی کی خاطر یہ سب کام کیے جا رہی تھی۔ محبوب کی لگن میں مگن تھی نا۔

ملازمہ کے آ جانے سے بڑی سہولت ہو گئی۔ کام کا بار نہ رہا۔ اب شبو کی ذمہ داریوں میں کمی آ گئی تھی۔ اس کا بیشتر وقت بناؤ سنگھار میں صرف

ہونے لگا۔ وسیم کے ساتھ شام کو سیر کے لیے جانا بھی معمول بن گیا تھا۔

حسن کے انمول خزانے قدرت نے بے دریغ لٹائے تھے۔ بناؤ سنگار میں وہ خود طاق تھی۔ جہیز کے نئے نئے کپڑے بھی تھے۔ شبو جب شام کو تیار ہو کر وسیم کے ساتھ باہر جاتی۔ تو اس پر کسی بہت بڑے گھر کی بیگم کا گمان ہوتا۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی۔ اسی جذبے کی تسکین پر تو وہ اتنا اہتمام کرتی۔ بڑی بڑی دکانوں میں چیزیں دیکھنے جاتی اور جب سیل مین بیگم صاحب بیگم صاحب کی گردان کرتے ہوئے چیزیں اس کے سامنے بکھیر دیتا تو وہ تسکین و مسرت کے بے پناہ جذبوں سے جھوم اٹھتی۔ ضرورت ہو یا نہ ہو وہ کوئی چھوٹی موٹی چیز اکثر خرید لیا کرتی۔

دن رات کا چکر معمول کے مطابق چلتا رہا۔ زندگی کی ڈگر پر وسیم و شبو ہاتھ میں ہاتھ دیے چلتے رہے۔ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے محبت کی رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے

ماں کو بہو بیٹے کا نیا طرزِ زندگی قطعاً پسند نہ تھا۔ وہ آمدنی کا مصرف اس ڈھنگ سے کرنا چاہتی تھی کہ وقت کی اونچ نیچ کے لیے کچھ پس انداز بھی ہو سکے۔ لیکن شبو کے خیالات کی اڑان بہت اونچی تھی۔ اس کے خواب بڑے سہانے تھے۔

اور

ماں دیکھ رہی تھی کہ شبو حقیقتوں سے فرار اختیار کر رہی ہے۔ اس کے خیالوں کی اڑان اور اس کے خوابوں کا حسن وسیم کی محدود آمدنی سے کبھی مطابقت نہیں کر سکتا۔ دو ایک بار اس نے دبی زبان سے سمجھانا بھی چاہا۔ لیکن شبو کے ماتھے

کی سلوٹوں نے آئندہ زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا۔

ماں کو بھی تو بیٹے کی خوشیاں ہی دیکھنا منظور تھیں۔ جب وسیم خوش تھا تو اسے خواہ مخواہ تلخیاں پیدا کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔

وقت کے ساتھ جب جذبات کی دھند چھٹی تو حقیقتوں کے چہرے واضح طور پر نظر آنے لگے۔ وسیم کو احساس ہوا کہ اس کے قدم اس کی زندگی کے متعین راستے کی طرف نہیں اٹھ رہے ۔۔۔ وہ ان آسائشوں اور سہولتوں کو گلے لگا لینے کے لیے ہمک رہا ہے جو اس کے مقدر کا حصہ نہیں۔ ابھی کچھ بگڑا نہیں تھا۔ قدم یہیں روک لینے ہی میں مصلحت تھی۔

اس نے شبو کو سمجھایا۔

اپنی مالی حالت کی وضاحت کر دی۔

شبو بھی جانتی تھی لیکن وسیم کے سمجھانے اور وضاحت کرنے سے اسے کچھ دھچکا سا لگا جیسے تیزی سے اونچائیوں پر اڑنے والے پرندے کے کسی نے بال و پر کاٹ ڈالے ہوں۔

وسیم نے شبو کے چہرے پر پھیلتے ہوئے تاریک سائے دیکھے مسکراتی آنکھوں میں دھند سی نظر آئی۔ اسے دلی صدمہ ہوا۔ کاش وہ شبو کے

حسین خوابوں کی تعبیر اسی حسین انداز میں کر سکنے کا اہل ہوتا۔

"شبو ۔۔۔ تم مغموم ہو گئیں ۔۔۔؟"

"جی نہیں ۔۔۔ تو ۔۔۔"

"وقت کا انتظار کرو شبو ۔۔۔ میری جد و جہد جاری ہے۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کروں گا ۔۔۔ بہت کچھ ۔۔۔"

شبو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی ۔۔۔ پُر اعتماد سی مسکراہٹ ۔۔۔ وسیم نے وفورِ مسرت سے بیتاب ہو کر یہ پُر اعتماد سی ۔۔۔ حسین سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں میں جذب کر لی۔

دونوں نے زندگی اپنی حدود کے اندر بسر کرنے کا عہد کر لیا۔ وسیم ہر ماہ تنخواہ لا کر شبو کے ہاتھ میں دے کر کہتا "بس یہی کچھ ہے۔ چاہو تو چیزیں خریدو ۔۔۔ چاہو تو روٹی کھلاؤ ۔۔۔ تمہارے حکم کے بندے ہیں۔ دیکھو ہم نے تو سگریٹ پینا بھی کم کر دیے ہیں ۔۔۔"

شبو مسکرا دیتی۔

لیکن یہ مسکراہٹ پہلے کی طرح جاندار نہ ہوتی۔ تنخواہ ضرورتوں کے منہ بند کرنے پر ہی صرف ہو جاتی تھی۔ کوئی نئی چیز خریدنے کا سوال ہی نہ رہتا، بیٹھک کے پردے کتنے پرانے ہو گئے تھے۔ لیکن چالیس پچاس روپے کوشش کے باوجود نہ بچتے ۔ اس دن وسیم تنخواہ لایا۔

حسبِ عادت مسکراتے ہوئے شبو کو پیسے تھما دیئے ۔۔۔ "تم جانو اور تمہارا کام !"

"اس دفعہ تو بیٹھک کے پردے ضرور لانا ہیں۔" شبو نے پیسے
لیتے ہوئے کہا۔

"پردوں کو کیا ہوا؟"

"لیجئے کچھ پتہ ہی نہیں۔"

"رہنے دو۔ ٹھیک ہیں۔ ہمارے ہاں کون ایسے مہمان آتے جاتے
ہیں ——— جو آتے ہیں وہ بھی اپنی ہی طرح ہوتے ہیں ——— یہ خواہ مخواہ کا
خرچ ہے۔"

"ہر خرچ ہی خواہ مخواہ کا ہوتا ہے۔" شبو کچھ بگڑ گئی۔

"پیسے یہی ہیں جو تمہیں دے دیئے ——— میں نہیں جانتا ———
پردے لاؤ یا نہیں۔ مہینہ پورا کرنا ہے بس ———"

وسیم ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ شبو بڑبڑاتے ہوئے تنخواہ کا
حساب کرنے بیٹھ گئی۔ لیکن پردے لانے کا سوال اپنی جگہ پر ہی رہا۔

صبح وسیم دفتر جانے کے لیے تیار ہوا۔ شبو پردوں کی ادھیڑبن
ہی میں تھی۔ آج ناشتے کو بھی دیر ہو گئی۔

"ناشتہ تیار ہے یا چلا جاؤں؟" وسیم نے صحن میں آتے ہوئے
کہا۔

"ابھی لائی دو منٹ میں۔"

اور پھر ناشتہ کی ٹرے اٹھائے شبو بیٹھک میں آ گئی۔

وسیم نے کرسی گھسیٹی۔ شبو نے ناشتہ میز پہ رکھ دیا۔

"دیکھئے نا کتنے خراب لگ رہے ہیں یہ پردے ——— رنگ بھی
اڑ چکا ہے ———"

"شبو ایک ہی بات کے پیچھے نہ پڑ جایا کرو ———" وسیم کرسی پہ
بیٹھتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

"آپ تو یونہی خفا ہو رہے ہیں ———"

"خفا کہاں ہو رہا ہوں۔ مجھے کیا کہتی ہو۔ گنجائش ہو سکتی ہے تو لے
آؤ پردے نہیں تو جانے دو۔"

"گنجائش تو کبھی ہو گی ہی نہیں ———"

"پھر یہ بے جا مصرف ہی تو ہے ——— کہاں سے پیسے پورے
کرو گی؟"

"کر لوں گی ———"

وسیم چپ ہو گیا۔

شبو نے چائے بنا کر پیالی وسیم کی طرف بڑھا دی۔

"دیکھئے نا ——— بڑے بڑے پھولوں والے پردے کیسے زیب
دیں گے۔ میں نے کشمیر ہاؤس پر کپڑا دیکھا تھا۔ سستا بھی ہے اور
خوبصورت بھی ——— صوفے کی مناسبت سے پھولدار پردے بڑے
اچھے لگیں گے ———"

"اچھا کیا نہیں لگتا ——— اس دری کی جگہ سرخ سرخ قالین بھی تو
اچھا لگتا ہے۔ مینٹل پیس پہ آرائشی چیزیں بھی تو اچھی لگتی ہیں۔ دیواروں

پر دلفریب سینریاں بھی تو اچھی لگتی ہیں۔ اس کونے میں بڑے سے
شیڈ والا لیمپ بھی تو اچھا لگتا ہے۔"
شبّو وسیم کے طنزیہ انداز کو نظرانداز کرتے ہوئے مسکرادی۔
"شبو ــــ حالات سے مطابقت کرنا سیکھو ــــ وہ ڈبل روٹی
کا ٹکڑا اٹھا کر اس پر مکھن لگانے لگا۔
شبو کی حسین پیشانی پر شکنیں آگئیں۔
"میں تو ابھی اس قرض سے سبکدوش نہیں ہو سکا۔ جو شروع شروع
میں ہم دونوں کی عاقبت نااندیشی کا نتیجہ ہے۔ تم ایسی باتیں کر کے اور الجھنوں
اور ذہنی پریشانیوں میں اضافہ کر دیتی ہو ــــ"
"جی ہاں ــــ" شبو غصے سے بپھر سی گئی ــــ "آپ تو زمانے بھر
کی ذہنی خوشیاں دے دیتے ہیں نا مجھے۔ میں ہی آپ کو ــــ"
اس کی آواز گھٹ گئی۔ خوبصورت آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
وسیم کا ہاتھ مکھن لگاتے ہوئے رک گیا۔ نظریں اٹھا کر اس نے
غور سے صوفے پر بیٹھی شبّو کو دیکھا۔
شبّو کے چہرے سے غصہ عیاں تھا۔ اور اس غصے کو پینے کی کوشش
میں وہ بار بار تھوک نگل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی جھلملا رہے تھے
وسیم کئی لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس کا دل بجھ سا گیا۔
پھر
اس نے ٹوسٹ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ چائے کی پیالی پرے ہٹا

دی ــــ جیب سے رومال نکال کر ہاتھ پونچھے۔
کرسی سے اٹھا ــــ میز پرے دھکیلی۔ اپنا فائل کیس اٹھایا اور
دروازے سے باہر نکل گیا۔
شبو نے اسے جاتے دیکھا لیکن روکا نہیں۔ اسے بھی تو غصہ آ رہا
تھا وسیم پر۔ کہاں کی جہاں دیدہ تھی۔ جو بات بڑھتے دیکھ کر وہیں روک لیتی
اس نے سائیکل دروازے سے ٹکرا کر نکلنے کی آواز سنی ــــ لیکن اپنی جگہ
سے اٹھی نہیں۔
وسیم بھوکا پیاسا دفتر چلا گیا۔ شبو وہیں بیٹھی منہ بسورتی رہی۔
لیکن
جب ملازمہ برتن اٹھانے آئی تو اسے وسیم کے بغیر ناشتہ کیے
چلے جانے کا احساس ہوا۔ اس کا غصہ دھیما پڑ گیا۔ وہ ٹھنڈے دل سے
سوچنے لگی۔ جوں جوں سوچتی گئی۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتا گیا۔ واقعی وہ ان
باتوں سے وسیم کی ذہنی پریشانیوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ آئندہ ایسا نہ کرنے
کا عہد کر کے وہ اٹھی۔ اور گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔
آج اس نے وسیم کے لیے خود کھانا بنا لیا۔ روٹھے ہوئے وسیم
کو منا لینے کا تصور حسین تھا۔ وہ کئی بار سوچتے سوچتے مسکرادی۔
ایک بج گیا پھر دو اور تین بھی بج گئے۔ وسیم دفتر سے نہیں لوٹا۔
وہ اس کے انتظار میں بے کل سی ہو گئی۔ وسیم کئی بار دفتر سے دیر کر کے آتا
تھا لیکن آج اس کی بے چینیوں کا رنگ کچھ اور تھا۔ وہ کئی بار ماں سے

پوچھنے لگی۔

"ماں جی ۔۔ آپ سے تو وسیم دیر سے آنے کا نہیں کہہ گئے تھے؟ جانے کیا بات ہے ابھی تک آئے نہیں۔"

"کچھ کام ہوگا" ماں اس کے اضطراب کو دیکھ کر جواب دے دیتی۔ "گھبراؤ نہیں۔ کئی دفعہ دیر سے لوٹتا ہے ۔۔"

شام ہو گئی۔

اور

پھر

تاریکیوں نے شام کے سلونے چہرے پر سیاہی کی تہیں چڑھا دیں

شبو کی بے چینیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

رات کی خنکی بڑھ رہی تھی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ وسیم ابھی تک نہ آیا تھا۔ ماں رضائی لپیٹے بیٹھی تھی۔ انتظار میں وہ بھی جاگ رہی تھی۔ لیکن شبو کو تو کسی صورت قرار نہ آتا تھا۔ کئی بار دروازہ کھول کر گلی میں جھانک چکی تھی اپنے کمرے کی کھڑکی میں بھی گھنٹہ بھر کھڑی اس کی راہ دیکھتی رہی تھی۔ انتظار کی شدت کے ساتھ ساتھ اپنے صبح کے طرز عمل پر پچھتاوہ بھی آ رہا تھا۔

سوا آٹھ بجنے کو تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ شبو سردی کے باوجود صحن میں گھوم پھر رہی تھی۔ مانوس دستک سن کر وہ دروازے کی طرف لپکی

"کون؟" اس نے حسب عادت پوچھا۔

"کھولو" وسیم کی گھمبیر آواز میں سرد مہری کا عنصر غالب تھا۔

شبو نے دروازہ کھول دیا۔ پٹ کھلے پائے وسیم کو دیکھا۔ قدرے مسکرائی۔

لیکن وسیم اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ شبو کے مچلتے ہوئے جذبات پر جیسے اوس پڑ گئی۔ اس نے وسیم کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ صبح کے واقعے کا اثر کم ہونے کی بجائے کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔

بے دلی سے دروازہ بند کر کے وہ واپس پلٹی۔ وسیم ماں کے کمرے میں چلا گیا۔

شبو کھانا گرم کرنے کے لیے باورچی خانے میں آ گئی۔

جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو وسیم پلنگ پر بیٹھا بوٹ اتار رہا تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑی اسے دیکھتی رہی ۔۔ خاموش سنجیدہ اور روٹھا روٹھا وسیم اسے کتنا بھلا لگ رہا تھا۔

وہ زیر لب مسکرا دی۔

وسیم نے سلیپر پہنے۔ کھونٹی سے کپڑے اتارے اور ساتھ والے چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد کپڑے تبدیل کر کے واپس آیا شبو کی طرف دیکھے بغیر پلنگ پوش ہٹایا۔ رضائی کھینچی اور بستر میں گھس گیا۔

شبو کے لبوں کی مسکراہٹ اس بے اعتنائی سے کچھ اور گہری ہو گئی۔

آہستگی سے وہ پلنگ کے قریب آئی۔ قدرے جھک کر "کھانا لاؤں؟"

وسیم منہ سر لپیٹے پڑا رہا۔

"کھانا لاؤں؟" شبو نے رضائی کا کونہ سرکایا۔

"نہیں" وسیم نے گھٹے سے لہجے میں کہا۔

شبو مسکراتے ہوئے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

وسیم نے کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

شبو نے اس کے بازو پر جھکتے ہوئے اس کا چہرہ اپنی طرف کرنا چاہا۔

وسیم نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

یہ جھٹکا شبو کے دل کو لگا۔ لیکن وہ ڈھیٹ بن کر ہنس دی۔

"ابھی تک غصہ باقی ہے" وہ کروٹ سے لیٹے وسیم پر اپنا بار ڈالتے ہوئے جھکی۔

وسیم کچھ نہ بولا۔

"کچھ تو بولیے ——" اس نے اپنا چہرہ وسیم کے چہرے سے لگاتے ہوئے کہا۔

وسیم چپ رہا۔

شبو اسے مناتی رہی۔ ناز و ادا کے انداز بدل بدل کر مناتی رہی لیکن جانے آج وسیم کن چکروں میں تھا۔ بپھرتا ہی چلا گیا۔

شبو کے پندار کو ٹھیس لگی۔ لیکن وہ ڈھیٹ بنی مسکرا مسکرا کر اسے مناتی رہی۔

"نہیں مانیں گے؟" بڑی بے چارگی سے تھک ہار کر اس نے کہا۔

"تنگ نہ کرو" بیزاری سے وسیم نے کہا اور پلنگ کے دوسری طرف سرک گیا۔

شبو کی خودداری تلملا اٹھی۔ ایک جھٹکے سے اس نے رضائی وسیم پر ڈالی پلنگ سے اٹھی اور ساتھ والے پلنگ پر جا گری۔ رضائی کھینچی اور منہ چھپا لیا۔

سارا اضطراب اور ساری بے قراری محبوب کی اس سرد مہری اور بے التفاتی سے آنسوؤں میں ڈھلنے لگی۔

وہ منہ چھپائے روتی رہی۔

وسیم نے اٹھ کر بتی گل کر دی۔ سگریٹ سلگایا۔ اور اندھیرے میں دھواں بکھیرتا رہا۔

شبو روتی رہی۔

اندھیرے کے باوجود وسیم کو اس کی سسکیوں کا احساس ہوتا رہا۔ اس نے کئی سگریٹ پھونک ڈالے۔ بار بار کروٹیں بدلیں۔ نیند اسے بھلا کیونکر آتی —— شبو رو رہی تھی۔ وہ سو کیسے سکتا تھا۔ اس کا غصہ اور افسردگی خود بخود مٹتی گئی۔ اسے دکھ ہونے لگا۔

سگریٹ گل کر کے اس نے کروٹ بدلی۔ چند ثانیے خاموشی سے شبو کی سسکیوں کو محسوس کرتا رہا۔

اور

پھر

ہاتھ بڑھا کر اس نے شبو کی رضائی کھینچ لی۔

شبو پلنگ کے دوسرے کنارے کی طرف سمٹ گئی۔

وسیم مسکرا دیا۔ روٹھی ہوئی شبو کو منانا آسان کام تھوڑا ہی تھا۔

ہاتھ بڑھا کر اس نے شبو کو بازو سے پکڑا۔ اور اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ شبو نے پوری قوت سے مدافعت کی لیکن وسیم کے مضبوط ہاتھوں سے چھٹکارا کہاں ممکن تھا۔ اس نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

شبو نے بھرپور غصے کے اظہار کے طور پر اس کی گرفت سے نکلنا چاہا۔

لیکن

ان مضبوط بازوؤں کا حلقہ تنگ ہوتا گیا۔

شبو اس کے چوڑے سینے سے لگی روتی رہی۔

وہ اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے اسے مناتا رہا۔

بڑی کاوشوں سے وسیم شبو کے آنسوؤں کا بہاؤ روک سکا۔

تلخیاں مٹ گئیں — رنجشیں دور ہو گئیں۔ دونوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے ہیں۔

دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔

"شبو!" وسیم نے آہستگی سے کہا۔

"جی" وہ چہک کر بولی۔

"بعض بے وقوف لوگ شادی کو محبت کی موت قرار دیتے ہیں لیکن

میں کہتا ہوں۔ شادی محبت کی اساس ہے — عشق کی بنیاد ہے — عشق و محبت کی پرشکوہ عمارت اسی اساس پر وقت کے ساتھ ساتھ اٹھتی چلی جاتی ہے۔ کیوں شبو! — ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

اور

شبو نے بڑے ہی والہانہ انداز میں اپنی بانہیں وسیم کے گلے میں ڈال کر سر اس کی چھاتی سے لگا دیا۔

وسیم کی دلیل کی کتنی حسین تائید تھی!

تلخ و شیریں واقعات کی آنکھ مچولی میں سال بھر کا طویل عرصہ گزر گیا۔ تلخی نے کبھی رشتۂ ازدواج کو مجروح نہیں کیا۔ یہ ہمیشہ جمود و ٹھہراؤ کو دور کرنے کا باعث ہی بنی۔

محبت کی جڑیں گہری ہوتی گئیں اور اس کا درخت پھلتا پھولتا گیا۔

ننھی لبنیٰ کی پیدائش نے تو ازدواجی بندھنوں کو اور مستحکم کر دیا۔ اس چھوٹے سے پیارے مہمان کی آمد سے تو گھر کی فضا ہی بدل گئی۔

وسیم کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ شبو کی مصروفیتوں میں اضافہ ہو گیا۔

لبنیٰ تھی تو ننھی سی جان ——— لیکن اس کی پیدائش سے اخراجات میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اس اضافے کی کسی حد تک شبو بھی ذمہ دار تھی شاید یہ اس کی انا کے انتقامی جذبے کی تسکین تھی۔ وہ خود بڑے گھر کی بیگم کا روپ نہ دھار سکی۔ لیکن اب اس اپنی بچی کو اس معیار پر اٹھانا چاہتی تھی۔ ڈھیروں ریشمی اور قیمتی فراکیں ——— کئی کئی اونی سٹ ——— ولایتی کمبل،

ریشمی بستر ——— شبو انتہائی غیر ضروری چیزوں کو بھی ضروری قرار دے کر پیسہ خرچ کر ڈالتی۔

وسیم پہلے پہل تو ان اخراجات سے بخوشی نپٹتا رہا۔ لیکن چھ ماہ کے اندر ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک بار پھر اپنی زندگی کے متعین راستے سے ہٹتا جا رہا ہے۔ ان آرائشوں اور سہولتوں کو بچی کے لیے مہیا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو اس کے مقدر کا حصہ نہیں۔

وہ اسی گام پر رُک جانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس بارہ میں اس نے شبو سے کھل کر بات کی۔

شبو چپ ہو گئی لیکن ناگواری کے اثرات اس کے چہرے سے ہویدا تھے۔ دن گزرتے گئے۔

جہاں تک بن پڑتا شبو من مانی کر لیتی۔ ہنس کر رو کر قائل کر لیتی ——— وسیم کے لیے پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ پچھلے چند دنوں سے ماں کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ دوا دارو کا خرچ بھی ناگزیر تھا۔ دفتر میں کام بھی بڑھ گیا تھا۔ ذہنی اور جسمانی کھچاؤ سے وسیم کچھ چڑچڑا سا ہو گیا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں اب خمار سے کہیں زیادہ پریشانیوں کا غبار ہوتا۔

وہ دفتر سے گھر لوٹتا ——— اگر شبو دلنواز مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی۔ تو وہ ذہنی آسودگی محسوس کرتا۔ اور غمِ روزگار سے نپٹنے کا حوصلہ بلند ہو جاتا۔ لیکن جس دن شبو کے رویے میں ٹھنڈک ہوتی۔ اس کے ذہنی کھچاؤ میں ناقابلِ بیان اضافہ ہو جاتا۔

اس دن وسیم کام کی زیادتی سے تھک سا گیا تھا۔ گھر پہنچ کر شبّو کی
لطیف مسکراہٹوں میں کھو کر وہ پُرسکون ہونا چاہتا تھا۔
شبو صحن ہی میں مل گئی۔ دل نواز تبسم نے وسیم کی ذہنی کلفتوں کو دھو
دیا۔ "گرم گرم چائے شبو ـــــ" کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔
گول مٹول سی لبنیٰ جالی دار جھولے سے پلنگ پر بے خبری سے
سو رہی تھی۔ سُرخ سُرخ گالوں پر اس نے جھک کر پیار کیا۔ رہی سہی تھکن بھی
جیسے دُور ہو گئی۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ پلنگ کے تکیے کے سہارے
نیم دراز ہو کر رسالہ دیکھنے لگا۔
شبو چائے لے آئی۔
"کپڑے بدل لیے آپ نے؟" اس نے چائے میز پر رکھتے ہوئے
پوچھا۔
"ہوں" وسیم رسالہ پلنگ پر ڈال کر اٹھ بیٹھا۔
شبو نے گرم گرم چائے کی پیالی اسے پکڑا دی۔
"آج بڑی دیر لگا دی؟"
"ہوں"
"کیوں"
"کام زیادہ تھا"
"میں کب سے انتظار کر رہی تھی"
"خیریت ـــــ" وہ پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے مسکرا دیا۔

"بازار جانا تھا ذرا"
"کیا خریدنا ہے" وسیم نے چائے کا گھونٹ لیا۔
"آپ سمجھ گئے" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"یہ ایسا کونسا معمہ ہے۔ جو سمجھنے میں دیر لگتی ـــــ" اس نے خالی
پیالی میز پر رکھ دی۔
شبو نے دوسری پیالی تیار کر کے اس کی طرف بڑھائی۔
"چائے پی کر جلدی سے تیار ہو جائیں" شبو اپنی چائے بناتے
ہوئے مسکرائی۔
"کچھ ایسا ہی ضروری کام ہے؟"
"بے حد"
"میں بھی جانوں تو ـــــ"
"بچہ گاڑی لینی ہے"
"بچہ گاڑی؟" وسیم کی چائے چھلک گئی۔
شبو مسکرائی ـــــ اور پھر بڑے حسین انداز سے اسے دیکھتے ہوئے
بولی "بچہ گاڑی ـــــ صاحب ـــــ بچہ گاڑی ـــــ اپنی میٹھی میٹھی
ـــــ پیاری پیاری بچی کے لیے ـــــ"
ممتا کے بھرپور جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے پلنگ پر سوئی لبنیٰ
کو دیکھا۔
"شبو ـــــ" وسیم سنجیدگی سے بولا۔

"جی" شبو اب بھی مسکرا رہی تھی۔

"یہ بچہ گاڑی کا پروگرام کس خوشی میں بن گیا ——؟"

"کیوں؟" شبو وسیم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے کوئی اندازہ نہ کر سکی۔

وسیم چپ رہا۔ خاموشی سے چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتا رہا۔ ذہنی کوفت اس کے خوبصورت لیکن مرجھائے سے چہرے سے پوری طرح عیاں تھی۔

"دیکھئے" شبو پھر مسکرائی "آپ سے پیسے نہیں مانگوں گی —— میرے پاس رقم ہے ——"

"رقم ہے یا نہیں کا تو سوال ہی نہیں۔ سوال تو ضرورت کا ہے۔ بلاضرورت چیزیں خریدنے کا فائدہ ——؟"

"بلاضرورت ہے بچہ گاڑی ——؟" شبو بُرا مان گئی۔

"بالکل۔" وسیم نے خالی پیالی میز پر رکھ دی۔

"اپنی خوشی سے کبھی تو بچی کی چیز کے لیے حامی بھر لیا کریں —— سات آٹھ ماہ کی ہو گئی ہے۔ بیٹھ بھی سکتی ہے اب تو —— سیر کے لیے بچہ گاڑی میں باہر جایا کرے گی۔"

"بچہ گاڑی کے ساتھ ایک عدد نوکر کی ضرورت بھی لاحق ہو گی۔"

"نہیں —— ملازمہ سے میں نے طے کر لیا ہے۔ صبح شام لے جایا کرے گی۔"

"شبو —— لبنیٰ اک غریب باپ کی بیٹی ہے ——" وسیم انتہائی سنجیدگی سے بولا۔ "اس کی پرورش بھی غریبوں جیسی ہونی چاہیئے۔ یہ لوازمات ہمارے لیے نہیں ہیں۔ ضرورتیں پوری ہو جائیں تو یہی غنیمت سمجھا کرو۔"

شبو کا کھلا ہوا چہرہ باسی پھول کی طرح دکھائی دینے لگا۔ دکھ بھری شاکی نظروں سے وسیم کو دیکھا۔

وسیم کا دل جیسے مسلا گیا۔ وہ شبو اور لبنیٰ کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو آسمان سے تارے توڑ کر ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا۔

"ہماری مالی حالت ان چیزوں کی متحمل نہیں ہو سکتی شبو۔" اس نے بڑے پیار اور ملائمت سے شبو کو سمجھانا چاہا۔ "اور جب ان چیزوں کے بغیر بھی گزارہ چل سکتا ہے تو پھر خواہ مخواہ جیب اور ذہن پر بوجھ کیوں ڈالا جائے۔"

"دیکھئے نا ——" شبو لہجے کو ایک بار پھر ہموار کرنے کے لیے مسکرائی "گاڑی خریدنے کے لیے جیب پر بار پڑے گا نہ ذہن پہ —— میرے پاس پیسے ہیں۔ کچھ میں نے جمع کیے تھے۔ کچھ اماں نے دے دیئے۔"

شبو نے بڑے فخر سے اپنی ماں کی دی ہوئی رقم کا ذکر کیا لیکن وسیم جیسا حساس انسان اس چوٹ کو گوارا نہ کر سکتا تھا۔ ہر چھوٹی بڑی ضرورت پہ شبو اپنی ماں کا سہارا لے لیتی تھی۔ وہ اس بارے میں شبو کو پہلے بھی کئی بار منع کر چکا تھا۔ آج اس ذکر سے وہ چڑ سا گیا۔

"اپنی ماں سے تم پیسے مانگ مانگ کر تم مجھے میری کم مائگی کا احساس دلانا چاہتی ہو۔"

"آپ تو بات کا بتنگڑ بنانے کے عادی ہو گئے ہیں۔" شبو نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ اور چائے کے برتن وہیں چھوڑ کر بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کی آنکھیں جل تھل تھیں۔ وسیم اسے دیکھتا رہ گیا۔

وسیم کو شبو پر بے انتہا غصہ آیا۔ دل ہی دل میں اس نے اس سے کئی شکوے کر ڈالے۔

لیکن جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ تو اسے شبو کی جل تھل آنکھوں کا خیال آ گیا۔ کتنی بے بسی نظر آئی اسے ان آنکھوں میں۔ وسیم دُکھ کے گہرے احساس سے مغلوب ہو گیا۔

وہ بڑی دیر بے حس پڑا سوچ کے سمندروں میں غوطے لگاتا رہا۔ شبو عورت تھی۔ جس کے پہلو میں ارمانوں اور آرزوؤں بھرا دل دھڑکتا تھا۔ وہ اچھے طریق سے رہنے سہنے اور کھانے پینے کی خواہاں تھی۔ اس میں اس کا قصور بھی کیا تھا۔ یہ اک عورت کی فطری مانگ تھی۔ اس مانگ کا گلا تو وسیم کی محدود آمدنی مسلسل گھونٹ رہی تھی۔

بڑی بے بسی اور دُکھ سے وہ شبو کے بارے میں سوچتا رہا۔ شبو مظلوم سی نظر آئی — بے تاب ہو کر وہ اٹھا۔ باورچی خانے میں شبو گیلی لکڑیوں کے کسیلے دھوئیں کو نگلتے ہوئے

آنسو پونچھ رہی تھی۔

وسیم کو آتے دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا۔

وہ آگے بڑھا۔

جھکا

اور

شبو کی کلائی پکڑ لی۔

شبو کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

"اٹھو" وہ دکھی آواز میں بولا۔

شبو نے آنچل سے آنسو پونچھ ڈالے۔

وسیم نے اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

شبو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رو رہی تھیں نا؟" اس نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اونچا کیا۔

شبو نے چہرہ جھکا لیا۔

"میں تمھیں کتنے دکھ دیتا ہوں شبو" لرزتی ہوئی گھمبیر آواز تھی۔ اس کے ہاتھ اب بھی شبو کی گداز اور سڈول ننگی کلائیوں کے گھماؤ پر بے قراری سے پھر رہے تھے — گہری حسین آنکھوں میں کرب سا تڑپ رہا تھا۔

شبو نے اسے دیکھا۔ وہ بے قرار ہو گئی۔

"معاف کر دو — آئندہ کچھ بھی نہ کہوں گا —" زخمی مسکراہٹ لبوں پر لیے وہ بولا۔

"پریشان ہو کر جھلا جاتا ہوں ـــــ ورنہ تمہارے لیے میں کیا کچھ نہیں چاہتا ـــــ"

"وسیم ـــــ" وہ ساری رنجشیں بھول کر اس کی چھاتی سے آلگی "مجھے معاف کردیں ـــــ" "غلطی میری ہے ـــــ آپ کو پریشان کردیتی ہوں"

اس نے اپنا سر اس کے کندھے سے لگا دیا۔ اور وسیم اس کے گھنیرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جانے کیا سوچنے لگا۔

شبّو اور وسیم نے اپنی مالی حدود کے اندر رہ کر زندگی بسر کرنے کا عہد کرلیا۔ بظاہر دونوں مطمئن ہو گئے۔ لیکن حقیقی سکون و اطمینان دونوں کی زندگی سے مٹ چکا تھا۔

شبّو زندگی کے دلفریب روپ سے بہت جلد متاثر ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات یہ تاثر اتنا گہرا ہوتا کہ شبّو اک مسکراتے روپ کے تعاقب میں دیوانہ وار دوڑ پڑنے کی خواہش دل میں پاتی۔ خوب صورت سا گھر جس میں سامانِ تعیش کی کمی نہ ہو ـــــ حسین لباس ـــــ نفیس زیور ـــــ اور ضروریاتِ زندگی سے ہنستے مسکراتے نپٹنے کے لیے کچھ اثاثہ ـــــ شبّو کا دل ان سلگتی خواہشوں سے بھرپور تھا۔

لیکن

وسیم کی آمدنی کو ان چیزوں سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ باپ کا چھوڑا ہوا گھر مقبر تھا۔ اس گھر کی ٹھیک طرح سے مرمت کروانے کے لیے

اس کے پاس پیسہ نہیں تھا سامان کچھ ماں کے سلیقے کا نچوڑ تھا۔ کچھ شبو جہیز میں لے آئی تھی لیکن ان چیزوں کے باوجود گھر اس روپ میں نہ ڈھل سکتا تھا۔ جس میں دیکھنے کی شبو خواہاں تھی۔ وسیم کی آمدنی تو زندگی کی بنیادی ضرورتوں کا منہ بسہولت بند کر سکتی تھی۔ ایسے ایسے لوازمات کی متحمل تو نہ ہو سکتی تھی۔

وسیم کے لیے یہی غنیمت تھا۔

لیکن

شبو

اس آمدنی پر قانع نہیں تھی۔

اور

وسیم

یہ سب کچھ بڑی اچھی طرح سے محسوس کر رہا تھا۔

گو شبو سے دو چار بار الجھنے کے بعد اس سلسلہ میں وہ خاموش ہو گئی تھی۔ وہ کسی خواہش کا برملا اظہار نہ کرتی۔ کسی چیز کے خریدنے کی فرمائش نہ کرتی۔ لیکن وسیم جیسا حساس انسان جانتا تھا کہ یہ خاموشی اک احتجاج ہے وہ اس کے ہونٹوں کی لرزشوں میں ان کہی خواہشوں کے لرزاں عکس بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

کبھی کبھی تو اسے اس خاموشی پہ جھنجھلاہٹ ہوتی — اسے شبو پہ غصہ بھی آجاتا۔ لیکن اکثر وہ اس کے بارے میں بڑی محبت سے سوچتا۔

وہ اسے کتنی عزیز تھی۔ کتنا پیار تھا اسے اس سے — یہ اس کا سمندر سے گہرا دل ہی جانتا تھا —

وہ اس کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ تو بے بال و پر پرندہ تھا۔ اتنی اونچی اڑان کا تصور بھی نہ کر پاتا۔

بینی کی پہلی سالگرہ قریب آ رہی تھی۔ لیکن شبو نے تو جیسے کچھ کہنے کی قسم کھائی تھی۔ مشین کی طرح کام کاج کرتی رہتی۔

"بینی کی سالگرہ آ رہی ہے۔" وسیم نے اس کی خاموشی سے تنگ آ کر خود ہی بات چھیڑی۔

"جی" اس کا مختصر سا جواب تھا۔

"کیا بندوبست ہے؟"

"کس بات کا؟"

"سالگرہ کا"

"بندوبست کیا کرنا ہے۔"

"کیوں بھئی۔ ہماری منی کی پہلی سالگرہ ہے — مناؤ گی نہیں؟"

"کیا ضرورت ہے۔"

"ضرورت کیوں نہیں؟"

"خواہ مخواہ کا خرچ ہی ہے —"

"خرچ کی بات چھوڑو — یہ بتاؤ کیا پروگرام ہے؟"

"میں نے تو کچھ سوچا نہیں —"

شبو کتنی دل گرفتہ سی تھی۔ وسیم کا دل چاہا اسے اپنے سینے میں چھپا
لے۔ اس سینے میں جس میں اسے خوش رکھنے کی ___ خوش دیکھنے کی لامحدود
خواہشیں مچل رہی تھیں۔

وسیم نے شبو کو سالگرہ منانے پر رضامند کر لیا۔ وہ محدود پیمانے
پر بچی کی پہلی تقریب منانا چاہتا تھا۔ وہ شبو کے ہونٹوں کا لُٹا ہُوا تبسم
واپس لوٹانے کے لیے یہ قدم اٹھا رہا تھا۔ حالانکہ اس فالتو خرچ کی گنجائش
نہیں تھی۔ پھر بھی وہ مُصر تھا۔

شبو مان گئی۔

اور

جب اس نے خرچ کا تخمینہ بتایا تو یہ وسیم کے اندازے سے
کہیں زیادہ تھا۔

سالگرہ منائی گئی۔ بچی کے لیے خوبصورت فراک اور قیمتی کھلونے
تحائف کی صورت میں آئے۔

"شغل کا شغل رہا اور منافع کا منافع" شبو مسرت سے تحائف
اکٹھے کرتے ہوئے وسیم سے بولی۔

وسیم نے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ شبو جو اُن دنوں اسے اک
گھٹی ہوئی آہ کی طرح دکھائی دیا کرتی تھی۔ ان لمحوں میں کتنی مسرور نظر آ رہی
تھی، بھرپور قہقہے لگا رہی تھی۔ کاش وہ قدم قدم پر شبو کے لیے ایسی ایسی
ہزاروں خوشیاں فراہم کر سکتا!

وقت گزر رہا تھا۔

سالگرہ کے بعد چند دن ہنسی خوشی گزرے۔ لیکن اس کے بعد وہی
جمود سا طاری ہو گیا۔

شبو اکثر خاموش رہتی۔ اس کے کھنکتے قہقہے اس کی دل نشیں ہنسی
کی گونج ماضی کی خلاؤں میں تو ضرور تھی۔ لیکن اب ___!

اب بے جان قہقہے ___ اور کھوکھلی ہنسی خانگی زندگی کو اور بے جان
بنائے جا رہی تھی۔

وسیم صبح و شام اس کا حل سوچتا رہتا۔ اپنی چھوٹی سی دنیا جسے شبو
نے بہار کی نئی رُت کی طرح آ کر مہکا دیا تھا۔ اسی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن
دو ڈھائی سال شبو کی رفاقت میں گزار کر اتنا ضرور جان گیا تھا۔ کہ یہ مہک
بہاروں کی جاودانی مہک اسی صورت میں لوٹ سکتی ہے۔ جب اس کی
آمدنی میں کسی طور اضافہ ہو جائے۔

اس نے اس عزم کے ساتھ دوڑ دھوپ شروع کر دی۔

بالآخر اسے ایک پرائیویٹ فرم میں عارضی طور پر کام مل گیا۔ شام تین
گھنٹے کام کے لیے اسے معقول تنخواہ مل گئی۔ دو سو روپے کا اضافہ کوئی
معمولی بات نہ تھی۔ وہ تندہی اور جانفشانی سے کام کرنے لگا۔

جگہ عارضی تھی۔ لیکن اس کی محنت اور دیانتداری دیکھ کر فرم نے اسے
مستقلاً ملازمت دے دی۔

وہ پورے عزم اور ہمت کے ساتھ پہلی نوکری کے ساتھ یہ دوسرا

کام بھی نبا ہنے لگا۔

دو

تین

چار مہینے گزر گئے۔ آمدنی کے اضافے نے حالات کی تیرگیوں سے
اُجالوں کو جنم دیا۔

چھوٹا سا گھر پھر چھوٹی سی جنت بن گیا۔ جس میں شبو بہار کی نئی رُت
کی طرح مہکتی رہی۔ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تھکان اور تردد کے سائے
چھٹ گئے۔ ہونٹوں کا لٹا ہوا تبسم لوٹ آیا۔ آنکھوں کی چمک اب آنسوؤں
سے دھندلائی ہوئی نہ تھی۔

وقت گزرتا گیا۔

گھر کی ہر چیز کے ساتھ ساتھ شبو کے حسن و جوانی بھی نکھرتے گئے۔
شبو نے امکان بھر اپنے دل کے ارمان نکالے۔ بیٹھک کے بوسیدہ
پردے بدل کے نئے پھول دار پردے لگائے۔ چھوٹا سا سُرخ قالین بھی
خرید لیا۔ کونے میں پرانے سے شیڈ والا اونچا سا لیمپ بھی آ گیا۔ اس نے
پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے کولر بھی خرید لیا تھا۔

اب اس کا گھر اس کی نو بیاہتا سہیلیوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس
کے پاس کپڑے بھی فیروزہ آپی سے کہیں زیادہ تھے۔ وہ اب مہمانوں کی
آمد پر فراخ دلی سے خرچ بھی کر لیتی تھی۔ چھوٹی بہن فری کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ
بھی خرید لیا کرتی تھی اور اس نے طلائی چوڑیوں کے لیے بھی تو پیسے جمع کر لیے تھے۔

ایک سال اور یونہی گزر گیا۔

لگاتار محنت نے وسیم کی صحت پر اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ اس کا
صحت مند جسم کمزور ہو گیا۔ اس کے چہرے پر تھکن کی دھول جم گئی۔ اس کی
کشادہ پیشانی کی سلوٹوں میں مسلسل محنت کی چھاپ گہری ہو گئی۔ اس کی
مخمور آنکھوں کا خمار ٹوٹ چکا تھا۔

لیکن وہ برابر کام کئے جا رہا تھا۔ شبو کی خاطر، شبو کے ہونٹوں
کے دلنواز تبسم کی خاطر، شبو کی آنکھوں میں جاندار مسکراہٹوں کی خاطر۔
اسے اپنی گرتی صحت کا دُکھ نہ تھا۔

لیکن

چند دنوں سے اس کی سوچ نے بھٹکنا شروع کر دیا تھا۔ جانے کیوں
اسے شبو کی ذات سے خود غرضی کی بُو آنے لگی تھی۔ اس نے کبھی بھی تو اسے
اس دوہری محنت سے منع نہیں کیا تھا۔ اس نے بھول کر بھی اس کی گرتی صحت

کا ذکر نہیں کیا تھا۔

سے تو جنون تھا صرف نئی نئی چیزیں خریدنے کا۔ اچھے اچھے کپڑے پہننے کا۔ چھوٹی بہن اور سہیلیوں کے ساتھ پکچر جانے کا ——— گھر پہ ہفتے عشرے بعد چھوٹی موٹی چائے پارٹی دینے کا ——— بس ———

وسیم اس کی ان کھما گہمیوں میں برابر کا شریک تھا لیکن پھر بھی جانے کیوں وہ سوچ میں ڈوب ڈوب کر گھٹن سی محسوس کرتا۔

دوپہر خاصی گرم تھی۔ نیلا آسمان دھوپ کی حدت سے مٹیالے رنگ کا ہو رہا تھا۔ وسیم دفتر سے گھر آ رہا تھا۔ دو میل کا راستہ طے ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ پسینے سے شرابور گھر آیا۔ پسینہ سوکھنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ وقتی طور پر طبیعت کچھ بحال ہو گئی۔ شبو کھانا لینے چلی گئی۔ اور وہ لبنیٰ کی ٹوٹی پھوٹی باتوں سے محظوظ ہونے لگا۔

"یہ نیا فراک کہاں سے لیا میری بیٹی نے؟" وہ ہلکے گلابی گھیردار فراک میں ملبوس لبنیٰ کو بازوؤں میں لیتے ہوئے بولا۔

"امی لائی۔"

"آج؟"

"ہاں جی" شبو کھانے کی ٹرے لیے اندر آئی ——— باپ بیٹی کی باتیں سن کر وہ مسکرا رہی تھی۔

"ماں جی کے کپڑے بھی لائی ہوں" شبو کھانا میز پر لگاتے ہوئے

بولی۔

"گرمی تو ایک دم آ گئی۔ ان کے پاس وائل کی قمیصیں نہیں تھیں۔"

"اچھا کیا" وسیم گود میں لبنیٰ کو بٹھائے کھانا کھانے لگا۔

"میں اپنی بھی دو قمیضیں لائی ہوں۔ اتنا خوبصورت پرنٹ ہے کہ کیا بتاؤں۔" شبو اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے مسکرائی۔

"اچھا کیا" وسیم نے اسی لہجے میں کہا۔

"قمیض ہی کے رنگ کے سینڈل بھی مل گئے۔ بڑے پیارے سے ——— ایک جوڑی رہ گئی تھی دکان دار کے پاس ——— آج نہ جاتی تو کبھی نہ ملتے۔"

شبو کھانا کھاتے ہوئے باتیں کر رہی تھی۔ وسیم کی طبیعت کچھ خراب سی ہونے لگی۔ شاید جسم نہانے سے سرگرم ہو گیا تھا۔ اس نے چند نوالے لینے کے بعد ہاتھ کھانے سے کھینچ لیا۔

"ایک چیز رہ ہی گئی۔"

"کون سی؟"

"قمیص کے ہم رنگ لپ سٹک"

"وہ بھی لے آتیں"

"پیسے ہی ختم ہو گئے تھے۔ لبنیٰ کے فراک خرید لیے نخفے آٹھ آٹھ روپے میں۔ بڑے اچھے فراک مل گئے ہیں۔"

شبو باتیں کر رہی تھی۔ وسیم کھانے سے ہاتھ کھینچ چکا تھا۔ لیکن اسے احساس تک نہ ہوا ——— ہاں جب خود کھا چکی تو وسیم سے ضرور پوچھا

"آج آپ نے پوری طرح کھانا نہیں کھایا؟"

برتن سمیٹ کر وہ ٹرے لیے چلی گئی۔

وسیم بستر پر لیٹ گیا۔ لبنیٰ کچھ دیر وہیں کھیلتی رہی ــــ پھر دادی کے پاس جاکر سوگئی۔

تقریباً چار بجے وسیم کی آنکھ کھلی۔ کچھ حرارت سی محسوس ہوئی۔ گھڑی دیکھی۔ کام پر جانے کے خیال سے آج سخت کوفت ہوئی۔ کافی دیر پلنگ پر کروٹیں بدلتا رہا۔

بادلِ نخواستہ اٹھا۔ خاکی پتلون اور سفید قمیص پہنی۔ بال بنائے اور پلنگ کے تکیے سے سر لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

شبو شربت کا ٹھنڈا ٹھنڈا گلاس لے کر اندر آئی۔ وسیم آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔

"پھر سو گئے؟" شبو نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے اس کا کندھا ہلایا۔

"ہوں۔" وسیم نے آنکھیں کھول دیں۔

سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر شبو گھبرا سی گئی۔ اس پر جھکتے ہوئے بولی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

وسیم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" زمانے بھر کی بے چینی اور گھبراہٹ شبو کی آواز سے مترشح تھی۔

"حرارت سی محسوس ہوتی ہے۔" وسیم نے آنکھیں بند کر لیں۔

"گرمی کا اثر ہو گا۔"

"شاید۔"

"شربت پی لیں۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔"

"نہیں۔"

شبو نے گھبرا کر اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ گال چھوئے۔ گردن ٹٹولی۔ کوئی خاص حرارت محسوس نہ ہوئی۔

"پی لیجیے شربت ــــ گرمی کا اثر معلوم ہوتا ہے ــــ اتنی دوپہر میں سائیکل پہ آنا کونسا آسان کام ہے۔ آج لو بھی چل رہی ہے ــــ"

وسیم نے بھنوئیں کھینچ کر شبو کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ شبو ہراساں سی نظر آرہی تھی۔

بے دلی سے وہ اٹھا۔ بال درست کیے ــــ اور باہر جانے کے لیے مڑا۔

"کہاں جارہے ہیں آپ؟" شبو اس کے راستے میں آ کھڑی ہوئی۔

"مزدوری کرنے۔" وسیم کے ہونٹوں پر مضمحل مسکراہٹ پھیل گئی۔

"طبیعت خراب ہے تو نہ جائیں نا" شبو کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اس نے غور سے وسیم کو دیکھا۔ یوں دیکھا جیسے آج پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ وہ سرتاپا بدل چکا تھا۔ رنگت دھندلائی ہوئی تھی۔ جسم بھی تو خاصہ کمزور لگ رہا تھا۔

"نہ جائیے" اس نے وسیم کا ہاتھ تھام لیا۔

"پیسے کٹ جائیں گے" وسیم کا انداز طنزیہ تھا۔

"جہنم میں جائیں پیسے" شبو اس کا بازو تھام کر اسے واپس لانے کو مڑی۔

"جانے دو شبو ـــ طبیعت کا کیا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی خواہ مخواہ ناغہ ہو گا۔ سات روپے ہیں"

"ہیں تو کیا ہوا"

"تمہاری لپ اسٹک ہی آ جائے گی"

وسیم نے شاید سادگی سے یہ جملہ کہا تھا لیکن شبو کے سینے میں تیر کی طرح اتر گیا۔ آج پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس نے وسیم سے کس قدر زیادتی کی ہے۔ اگر وہ اپنی محدود آمدنی پر ہی قانع رہتی تو آج وسیم کے سارے وجود کی بنیادیں یوں نہ ہل گئی ہوتیں۔ اس کے بازو پر ملائمت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اسے کام پر جانے سے منع کرنے لگی۔

"جانے دو شبو۔ دیر ہو رہی ہے" وسیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"نہیں ـــ" وہ روہانسی سی ہو کر اس سے لپٹ گئی "میں آپ کو نہیں جانے دوں گی ـــ وسیم ـــ نہیں جانے دوں گی ـــ آپ یہ کام چھوڑ دیں ـــ ہم اپنی محدود آمدنی ہی میں گزر کر لیں گے وسیم ـــ آپ کی صحت کتنی گر گئی ہے"

وہ اس کے سینے سے لگی سسک رہی تھی۔ وسیم کچھ حیرت کچھ مسرت کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ چھوڑ دیں یہ کام ـــ" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے وسیم کو دیکھا۔

"روتی کیوں ہو پگلی ـــ" وسیم نے اسے تھپ تھپایا۔

"آپ کتنے کمزور ہو گئے ہیں ـــ اتنی محنت ـــ" وہ پھر روہانسی ہو گئی۔

"پیسے ملتے ہیں شبو" اس نے گال تھپ تھپایا۔

"مجھے پیسے نہیں چاہئیں ـــ آپ کی صحت چاہیئے ـــ میں آپ کو اب کبھی نہ جانے دوں گی ـــ کبھی نہ جانے دوں گی"

وہ بڑے والہانہ انداز سے اس سے پھر لپٹ گئی۔

اور

وسیم کی ساری کلفتیں دور ہو گئیں ـــ شبو سے اسے کوئی شکوہ نہ رہا ـــ کوئی شکایت نہ رہی ـــ وہ اس کے سینے سے کس اپنائیت سے لگی سسک رہی تھی۔ اس کی لازوال محبت محسوس کر کے وسیم کا انگ انگ خوشی سے ناچ اٹھا۔

"شبو" وسیم نے اسے بازوؤں میں سمیٹ کر اپنا گال اس کے سیاہ بالوں پر ٹکا دیا "تمہیں میرا خیال ہے۔ میرے لیے یہ احساس ہی جانفزا ہے۔ اب میں کوئی تھکن کوئی اضمحلال محسوس نہیں کروں گا شبو ـــ یہ کام تو کام تمہاری خوشیوں کی خاطر تو میں جان بھی قربان کر سکتا ہوں"

"وسیم" فرطِ جذبات سے شبو کی آواز بھرا گئی۔

"میری شبو" لطیف سی سرگوشی فضا میں تحلیل ہو گئی۔

"یہ ماں بیٹی کدھر کی تیاری کر رہی ہیں؟" وسیم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا ــــ اس کے ہاتھ میں رنگ برنگی ٹافیوں کا لفافہ تھا۔ لبنیٰ کو دکھاتے ہوئے اس نے لفافہ ہوا میں لہرا دیا۔

اڑھائی سالہ لبنیٰ سنگار میز کے قریب کھڑی شبّو سے بال بنوا رہی تھی۔ لفافہ دیکھتے ہی اُچھلی۔

"بال تو بنوا لو ـــ" شبّو نیلا ربن بالوں میں اٹکانے لگی۔

وسیم نے پھر لفافہ ہوا میں لہرایا ــــ نیلے فراک میں ملبوس لبنیٰ ربن بندھوائے بغیر ہی دوڑی۔

وسیم نے لفافہ ذرا سا نیچا کیا لبنیٰ لپکی ــــ وسیم نے لفافہ اونچا کر لیا ــــ لبنیٰ اچھل اچھل کر پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اچھلتی تو وسیم لفافہ نیچے کر دیتا۔ وہ پکڑنے لگتی تو ہوا میں لہرا دیتا۔

"ابو!" دو چار بار کی اچھل کود سے لبنیٰ کو صبر کا یارا نہ رہا۔

وسیم نے لفافہ اونچا کیا

وہ اُچھلی۔

اور وسیم نے اس سُرخ و سفید گول مٹول سی گڑیا کو پیار سے بازوؤں میں لے لیا۔ لفافہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے جھک کر اس نے اس کے گالوں پہ پیار کیا۔

شبّو مسرت بھری نظروں سے باپ بیٹی کا کھیل دیکھ رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وسیم شبّو کی طرف پلٹا۔

"امّاں کے ہاں۔"

"خیریت ہے؟"

"بالکل ـــ"

"پھر اس وقت کیوں جا رہی ہو؟"

"امّاں نے بلا بھیجا ہے۔ فری کی نسبت آئی ہے۔"

"بہت خوب۔"

وسیم کمرے سے نکل گیا۔ ماں صحن میں بیٹھی تھی۔ لبنیٰ ٹافیاں نکال نکال کر اس کے سامنے بکھیر رہی تھی۔ وسیم کچھ دیر ماں کے پاس بیٹھا۔ پھر واپس کمرے میں آ گیا۔ شبّو نیلی سادہ سی ساڑھی پہنے سنگار میز کے سامنے کھڑی بالوں کو سنوار رہی تھی۔

ہلکا نیلا رنگ وسیم کو شبّو ہی کی طرح محبوب تھا۔ وہ والہانہ اس کی طرف بڑھا۔

شبو اس کے تیوروں کو بھانپ کر ہنس دی — دیکھئے — بس
دور ہی سے دیکھئے۔"

"یہ رنگ پہن کر میرے صبر کا امتحان نہ لیا کرو شبو — نیلے نیلے
آسمان پر چودھویں کا چاند چمکتے دیکھا ہے کبھی —؟" اس نے شبو کے گلے
میں باہیں ڈال دیں۔

"شاعری رہنے دیں۔" شبو کا چہرہ اپنی تعریف سن کر دمکنے لگا تھا۔

"اس چاند کو صرف دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ چاند —" سر جھکا کر
اس نے شبو کے ملائم بالوں کو ہونٹوں سے چھو لیا۔

شبو کسمسائی۔ لیکن وہ بڑے ہی والہانہ انداز سے اسے پیار کئے گیا
ان دنوں وہ کتنا مسرور تھا۔ خانگی زندگی اک خاص نہج پہ آ چکی تھی۔ شبو بھی تو
اب اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ پیار کے اظہار کے کئی طریق آزماتی تھی۔
وسیم کو ہر طرف بہاروں کا حسن ہی حسن نظر آتا تھا۔

خلوص و وفا کے سہارے کتنے مضبوط تھے۔ وسیم کو کام کی تھکن
ہوتی۔ نہ کوفت۔ شبو کی محبوب مسکراہٹوں کے سہارے وہ کٹھن سے کٹھن
کام بھی خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتا تھا۔

رات شبو واپس آئی۔ تو دیر تک ساس کے کمرے میں وسیم کے
ساتھ بیٹھی رہی۔ نری کی نسبت آئی تھی۔ اسی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

"لڑکا کیا کرتا ہے؟" ساس نے پوچھا۔

"اپنا کاروبار ہے۔ وہ جو نہر کے پار کارخانہ ہے نا —!" شبو

وسیم سے مخاطب تھی۔

"کونسا — ربڑ کا —؟" وسیم بولا۔

"شاید ربڑ ہی کا ہے —" وہ بولی — "کارخانے کا مالک ہے"

"کون — اسحاق —" وسیم نے تعجب اور حیرت سے شبو
کی طرف دیکھا۔

"اسحاق ہی نام ہے۔"

"اسحاق کی نسبت آئی ہے؟"

"جی۔"

"وہ — وہ —" وسیم کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"پہلی بیوی مر چکی ہے۔ صرف دو لڑکے ہیں —" شبو مسکرائی۔

"نری کے لیے تو یہ رشتہ کسی طرح بھی موزوں نہیں۔"

"کیوں؟"

"سوائے دولت کے اور وہاں ہے ہی کیا۔ پینتالیس پچاس سے
کم نہ ہو گا۔ اور صورت شکل — چغد دکھائی دیتا ہے — ویسے
بھی ہر عیب —"

"پھر تو سوچ سمجھ کر رشتہ کرنا چاہیئے۔ بچی کی عمر ابھی کیا ہے۔
انیس بیس کی ہو گی —" ماں نے اپنی رائے دی۔

"اماں۔ کوئی جوڑ بھی ہو —" وسیم بولا۔ "کہاں نری اور کہاں
اسحاق۔ اسے شہر کا کونسا آدمی نہیں جانتا۔ ہمہ صفت موصوف ہے۔"

"سجاد بھائی بھی نہیں مان رہے —" شبّو بولی۔

"کوئی عقلمند انسان ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" وسیم نے کہا۔

رشتہ کی بات کئی دن چلتی رہی۔ شبو کی ماں اس کی حامی تھی۔ بھائی خلاف تھا۔ وسیم بھی سب کچھ جانتے ہوئے اس حق میں نہیں تھا۔

اس رات آخری فیصلہ کے لیے شبو کی ماں کے کمرے میں سبھی جمع تھے۔ لے دے ہوتی رہی۔ شبو بھی ماں کا ساتھ دے رہی تھی اور ماں تو کسی صورت اس رشتہ سے دستبردار ہونے کو تیار ہی نہ تھی۔

"رشتے آج کل ملتے کہاں ہیں۔ یہ تو میری فری کا نصیب ہی کچھ بلند معلوم ہوتا ہے — عمر زیادہ ہے تو کیا ہوا — دولت والوں کی عمر کس نے دیکھی —"

"شکل و صورت کا تضاد — عمروں کا فرق — اور پھر اس میں پانچوں عیب —" سجاد نے پُرزور مخالفت کی۔

"بھائی جان — شکل صورت کی بات جانے دیں۔ نہ ہی عمر کے فرق سے کوئی فرق پڑتا ہے۔ باقی رہی اس کی عیاشی۔ تو آج جس کے پاس پیسہ ہے — وُہ یہ لوازمات جاری رکھتا ہے —" شبّو نے دلیل دی۔

"تم نے تو ساری بات ہی ختم کر دی —" سجاد بھڑک اٹھا۔

"دولت ہی سب کچھ ہے بھائی جان — فری کی زندگی سنور جائے گی۔ عمر بھر عیش کرے گی — یہ موقع مل رہا ہے۔ اس سے فائدہ کیوں نہ اُٹھائیں۔"

شبو کی باتیں سنکر وسیم اسے صرف دیکھتا رہ گیا۔

ماں بیٹی دولت کو اتنی اہمیت دے رہی تھیں۔ سجاد کی دال نہیں گلتی تھی۔ وسیم نے اسی لیے کوئی رائے دینا مناسب ہی نہ سمجھا۔

ویسے شبّو کی باتوں سے وہ کچھ ملول سا ضرور ہو گیا۔

بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہا۔

دو موٹریں — خوبصورت کوٹھی — پورا کارخانہ — اور پیسے کی ریل پیل بہت بڑی آزمائش تھی۔ شبّو اور اس کی ماں بھلا کیسے چھوڑ دیتی۔ سجاد کیا کرتا۔ اور جب فری نے شبّو کی وساطت سے رشتہ کی حامی بھر لی۔ تو پھر بیچارے سجاد کے لیے ہاں کر دینے کے سوا چارہ ہی نہ رہا — وسیم سارا عرصہ خاموش تماشائی بنا رہا۔

ہاں ہو گئی

اور

پھر شادی بھی۔

فری تو فری — شبّو کی خوشیوں کا بھی ٹھکانہ نہ رہا۔ سارا دن تعریفیں ہی کرتی رہی۔ کبھی کوٹھی کی — کبھی سامان کی — کبھی ملبوسات کی — کبھی زیورات کی —

ماہِ عسل منانے کے بعد فری گھر لوٹی تو اس نے شبو کو بلا بھیجا۔
امیر بہن کا بلاوہ اور شبو نہ آتی۔ ایک ہی بار کہلانے پہ کھنچی چلی آئی۔
دونوں بہنیں بڑی محبت سے ملیں۔ فری شام تک اسے اپنے
قصے سناتی رہی۔ اپنی تصویریں دکھاتی رہی۔
"میں ذرا اپنے گھر کو نئے طریقے سے آراستہ کرنا چاہتی ہوں
اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔ میری مدد کرو گی نا؟ —— میں بڑی بڑی خوبصورت
چیزیں خرید کر لائی ہوں —— اسحاق نے کہہ دیا ہے کہ جس طرح چاہو
گھر کو ترتیب دوں۔ جتنا چاہوں خرچ کروں! مجھے تو بعض اوقات یوں
لگتا ہے۔ جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہوں۔ کہاں ہم اور کہاں یہ
ماحول —— یہ زندگی —— شبو —— اپنے نصیب پہ خود ہی رشک
آنے لگتا ہے ——"
فری بڑے تفاخر سے کہہ رہی تھی اور اس کی خوشنودی کے

لیے شبو ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ فری کے نصیب پہ اسے بھی تو رشک آ رہا تھا۔
دوسرے دن سے گھر کی الٹ پلٹ شروع ہو گئی۔ نوکروں کی تو
شامت ہی آ گئی۔ فری اور شبو نے بھی تو دن دیکھا نہ رات —— کبھی
بازار جا رہی ہیں —— کبھی چیزیں لا رہی ہیں —— اس کمرے کو بدلا اسے
الٹ پلٹا —— جو چیزیں ناپسند تھیں اٹھوا دی گئیں۔ جو پسند تھیں وہ
خریدی گئیں۔ نئی بیگم کا ذوقِ آرائش دیکھ دیکھ کر اسحاق پھولا نہ سمایا۔ یوں
بھی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد گھر نوکروں کے رحم و کرم پہ تھا۔ اب تو
فری اور شبو کی محنت سے فردوس کا گوشہ سا دکھائی دینے لگا تھا۔
شبو آٹھ دن فری کے ہاں رہی۔ یہ آٹھ دن اتنی مصروفیت کے
تھے کہ اسے اتنا بھی خیال نہ آیا۔ کہ گھر میں اس کی بوڑھی ساس ہے۔ وسیم
کو ناشتہ وقت پہ ملتا بھی ہو گا یا نہیں؟
کاموں سے فارغ ہو کر شبو کو گھر جانے کا خیال آیا۔
"ایسی بھی کیا جلدی ہے شبو۔ ابھی تو گھر کے جھمیلے ہی سے فارغ
ہوئے ہیں۔ آرام سے تو بیٹھے ہی نہیں۔" فری نے پُرخلوص سا اصرار کیا۔
"پھر آ جاؤں گی —— اب جانے دو —— میری ساس کی طبیعت
بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ آٹھ دن ہو گئے —— جانے کیسے نپٹ رہی ہوں
گی کام سے۔"
"اچھا شام کو چلی جانا —— لبنیٰ کے لیے تو ابھی میں کچھ لائی ہی
نہیں ——"

"کیا لانا ہے؟"

"کچھ فراک، کچھ کھلونے۔ اس کا حق تو ہے ہی۔"

"پھر سہی۔"

شبو واپس آنا چاہتی تھی۔ اسحاق نے بھی کچھ دن اور رکنے کے لیے کہا لیکن بیکار بیٹھے رہنا مناسب نہیں تھا۔

فری نے ڈرائیور کو بلا کر شبو کو گھر چھوڑ آنے کو کہا۔

موٹر پورچ میں آ گئی۔ شبو بہن سے مل کر لبنیٰ کو ساتھ لیے اپنا چھوٹا سا بیگ پکڑے موٹر میں آ بیٹھی۔ موٹر چل دی۔

ستون کے ساتھ بیش قیمت ساڑھی والی فری کو وہ دور تک ہاتھ ہلاتی رہی۔

وسیع و عریض چمنوں والی کوٹھیوں کے آگے بچھی ہوئی آسودہ سی سڑک سے موٹر پھسلتی ہوئی گنجان آباد بازار میں جا پہنچی — اسی بازار کے آخری سرے والی گلی میں شبو کا گھر تھا۔ غنیمت تھا۔ جو گلی کشادہ تھی۔ موٹر دروازے تک آ سکتی تھی۔

لبنیٰ کو لیے وہ موٹر سے باہر نکلی۔ ہمسائی چق کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ شبو کا سر فخر سے کچھ اونچا ہو گیا۔ نیم وا دروازہ کھول کر وہ گھر میں داخل ہوئی۔ ڈرائیور بیگ صحن میں رکھ کر سلام کر کے چل دیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی شبو کے محسوسات پر جیسے اوس پڑ گئی۔ اجنبیت کا احساس لاشعور کی گہرائیوں میں مچلنے لگا۔ صحن میں کھڑے کھڑے

اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بے رنگ و روغن دروازے، کھڑکیاں، بوسیدہ چھت — میلی میلی سی سفیدی — اپنا ہی گھر عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہمسائی کے سامنے موٹر سے نکلنے کا جو خوشی کا احساس تھا۔ وہ کہیں ڈوب کر رہ گیا۔ جتنی خوش آئی تھی۔ اتنی ہی اداس سی ہو گئی۔

"آ گئیں شبو بیٹی!" ساس کی آواز پر وہ سامنے والے کمرے میں داخل ہو گئی۔ بجھے بجھے دل سے آداب کیا، احوال پرسی کی۔

وہ فری کا حال احوال پوچھنے لگیں۔ اور شبو — اس میلے سے بستر والے لکڑی کے پلنگ کو دیکھتے ہوئے ہوں ہاں میں جواب دینے لگی۔

پرانے پلنگ اور میلے بستر پر بیٹھی ہوئی ساس کو وہ عجیب عجیب نظروں سے گھور رہی تھی۔ کتنی کراہت محسوس ہوئی اسے — گھبرا کر وہ دوسرے کمرے میں آ گئی۔ لکڑی کے تخت پر پچھلے سال کا خریدا ہوا کولر پڑا تھا۔ ایک دم سے اسے فری کے ریفریجریٹر کا خیال آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ کولر اس کا مضحکہ اڑا رہا ہو۔ اس کا دل چاہا کولر کو اٹھا کر گلی میں پھینک دے۔ یہ بھی بھلا کوئی گھر میں رکھنے کی چیز تھی۔

جلدی سے وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ لاشعوری طور پر وہ اس کا موازنہ فری کے ڈرائنگ روم سے کرنے لگی۔ لیکن اس وسیع و عریض دلہن کی طرح آراستہ ڈرائنگ روم کی اس چھوٹی سی بیٹھک سے نسبت ہی کیا تھی۔

اداسیوں کا سیلاب سا امڈ آیا — صوفے پر گر کر جانے تک

وہ اس سیلاب میں حقیر تنکے کی طرح بہتی گئی۔

"واہ وا ـــ آگئیں ہماری بیٹی ـــ اتنے دن لگا دیے خالہ کے ہاں ـــ؟"

وسیم شاید لبنیٰ سے کہہ رہا تھا۔ شبو ایک دم اٹھ بیٹھی ـــ سر جھٹک کر خیالاتِ پریشاں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔

وسیم اندر آگیا۔ شبو ہونٹوں پہ جبری مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔

"اتنے دن لگا دیے شبّو ـــ یقین مانو۔ گھر ویرانہ لگتا تھا تمہارے بغیر ـــ"

شبو کا جی چاہا کہہ دے "ویرانہ نہیں تو گلزار ہے کیا؟ ـــ" لیکن اس نے لب نہیں کھولے ـــ اخلاقاً مسکراتی رہی۔

یہ مسکراہٹ آوردہ تھی۔

"کیا حال ہے فری کا۔ خوب سیریں کر کے آئی ہو گی ـــ" وسیم پوچھ رہا تھا اور شبّو جواب دیتے ہوئے اس کی خاکی پتلون اور سفید قمیض کا موازنہ اسحاق کے رنگ برنگے قیمتی ٹھنڈے سوٹوں سے کر رہی تھی۔

شبو کی بے کلی بڑھتی گئی۔ رات وہ وسیم سے لپٹ کر سوئی۔ اس کا یہ والہانہ پن بناوٹ نہ تھا۔ ہاں اس کے پسِ پردہ جذبات یکسر نئے تھے۔

روح کی بے کلی کئی دن رہی۔ احساسِ کمتری سے وہ بجھی بجھی رہی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ نئے لگاؤ سے گھر کی صفائی کی۔ صابن اور برش سے دروازوں، کھڑکیوں کے پٹ دھوئے۔

دیواروں کی جھاڑ پونچھ کی۔ پلنگوں کی جگہ بدلی۔ سنگار میز اپنی جگہ سے کھسکائی۔ بیٹھک کی تو ترتیب یکسر بدل دی۔

لیکن

اس ساری ذہنی اور جسمانی کاوش سے وہ مطمئن نہ تھی۔ سادہ سا صوفہ فری کے نرم ربڑ کے صوفوں کا روپ نہ دھار سکا۔ کاٹن کے معمولی پردے بھاری ریشمی پردوں کا بدل نہ بن سکے۔ لکڑی کے سادہ سے پلنگ، لچکتی ہوئی ڈبل بیڈنگ نہ ہو سکی۔ کولر، ریفریجریٹر نہ بن سکا ـــ ہر چیز نے اسے اس کی کم مائیگی کا احساس دلایا۔ تین کمروں اور چھوٹے سے صحن والا گھر فری کی خوبصورت اور آراستہ کوٹھی کے سامنے کتنا حقیر سا نظر آتا تھا۔

اس گھر کے گھٹے گھٹے ماحول میں اک عجیب سی بیزاری اس کے رگ و پے پر چھانے لگی۔

بیزاری جسے وہ وسیم سے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔

لیکن سمندر کی ساکن سطح تلے طوفان جنم لے چکے تھے۔

فری کے ہاں ڈنر تھا۔

شبو کئی دنوں سے تیاری کر رہی تھی۔ ساٹن کا زنگالی سوٹ سلوایا تھا۔ سینڈل بھی نیا خریدا تھا۔ میک اپ کے سامان میں بھی کئی نئی چیزوں کا اضافہ کیا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھی۔ ساٹن کا سادہ سوٹ نگاہوں میں نہیں جچتا تھا۔ یہ ڈنر متمول طبقے کا اجتماع تھا۔ ملبوسات اور زیورات کی نمائش تھی۔ شبو اس تقریب کے لیے کوئی قیمتی سا لباس چاہتی تھی۔

دعوت کی رات آ گئی۔

سرِ شام ہی شبو اپنے کپڑوں کے صندوق کھول کر بیٹھ گئی۔ زنگالی سوٹ سے اچھا شاید کوئی اور ہی لباس مل جائے۔

اس نے جو گیا ساڑھی نکال کر پلنگ پر پھیلا دی لیکن کئی بار پہننے سے وہ مسلی مسلی سی تھی۔ نیلی ساڑھی تو اس نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اتنی

سادہ سی ساڑھی کا بھلا اتنی پُر تکلف دعوت میں کیا مقام! فیروزی ساڑھی کا باڈر بالکل چھوٹا تھا۔

اس نے کئی جوڑے کپڑے نکال نکال کر پلنگ پہ پھیلائے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نظر نہ آیا۔ جسے وہ آج رات پہن سکتی۔ یہی کپڑے کبھی وہ بڑے فخر سے سہیلیوں کے ہاں پہن کر جایا کرتی تھی لیکن اب اس کا نظریہ بدل چکا تھا۔ بھلا فری کے کپڑوں کے سامنے ان کی کیا وقعت!

ہر پھر کر زنگالی سوٹ ہی تھا۔ جو وہ آج رات پہن سکتی تھی لیکن یہ سادہ سا سوٹ اسے اپنی کم مائگی کا کھلا اشتہار معلوم ہو رہا تھا۔ کاش اس کے پاس بھی بھاری بھاری کناروں والی کوئی ساڑھی ہوتی جسے آج رات پہن کر وہ اپنی کم مائگی کو وقتی طور پر ہی سہی لیکن ڈھانپ تو لیتی۔

کمرے کے ملگجے اُجالے میں وہ پریشان سی بیٹھی چاروں طرف بکھرے کپڑوں کو دیکھ رہی تھی۔

وسیم آ گیا۔

اس نے آتے ہی بتی جلائی۔

"یہ کیا نمائش لگا رکھی ہے؟" اس نے شبو کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

"نمائش" وہ زیرِ لب بڑبڑائی — اس نے چاہا — نمائش کی جگہ نیلامی کہہ دے۔ لیکن وہ چپ رہی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" وسیم صندوق پر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی۔

"توبہ ہے تم عورتوں سے ۔۔۔ کہیں جانا کیا ہوتا ہے مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے۔ دیکھو تو سارا کمرہ کپڑوں سے بھرا پڑا ہے لیکن میرا خیال ہے انتخاب ۔۔۔؟"

"سوچ رہی ہوں کیا پہن کر جاؤں۔"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ کوئی سے کپڑے پہن لو۔"

"کوئی سے ۔۔۔؟" وہ شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔ "جانتے ہیں کتنی بڑی دعوت ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔"

"جی ہاں۔ فرق کہاں پڑتا ہے۔؟"

"حسن کسی زیبائش کا محتاج نہیں ہوتا۔" وسیم ترنگ میں تھا۔ شبو کی ٹھوڑی کو چھو کر مسکرایا۔

شبو الجھی بیٹھی تھی۔ اٹھلا کر مسکرا کر وسیم کی طرف دیکھا نہیں۔ وسیم اٹھا۔ پلنگ پر نارنگی نیا سوٹ دیکھ کر بولا۔ "یہ نئے کپڑے جو ہیں۔ کتنا خوبصورت رنگ ہے۔ پتوں میں گھرا ہوا پھول نظر آؤ گی ۔۔۔"

شبو بھی اٹھی۔ سوٹ کو ہاتھوں پر اٹھا کر دیکھا۔

وسیم نے کپڑے اس کے چہرے سے لگا دیے۔ "ذرا میری نظروں سے دیکھو۔ کیا لگ رہی ہو ۔۔۔؟"

"نئے تو ہیں لیکن ۔۔۔؟"

"لیکن کیا؟"

"رات کے وقت کوئی چمکیلا لباس ہونا چاہیئے۔"

"چمک تو رہا ہے یہ سوٹ ۔۔۔"

"ہائے اللہ۔ آپ کو کون سمجھائے ۔۔۔ یہ سوٹ سادہ ہے ۔۔۔ کوئی کامدانی کام کا کپڑا ہوتا ۔۔۔ یا کوئی ساڑھی ۔۔۔"

"ساڑھیاں تو تمہارے پاس بہت سی ہیں۔ یہ نیلی پہن لینا۔"

"اونہہ"

"کیوں ۔۔۔ چاند نظر آؤ گی ۔۔۔ چاند ۔۔۔؟"

"بالکل سادی ہے ۔۔۔"

"توبہ بابا ۔۔۔ یہ پہن لینا؟" اس نے جوگیا ساڑھی کی طرف اشارہ کیا ۔۔۔

"پرانی ہے ۔۔۔"

"اور یہ ۔۔۔؟" اس نے فیروزی ساڑھی پر انگلی رکھتے ہوئے شبو کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا۔ شبو اسے بھی ناپسند کرے گی۔ اسی لیے زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"اس کا کنارہ چھوٹا ہے ۔۔۔" شبو نے برا سا منہ بنایا۔ "کوئی بھاری بارڈر والی ساڑھی ہوتی تو بات بھی تھی ۔۔۔"

"اتنے پیسے خرچ کرتی ہو۔ بھاری بارڈر والی ساڑھی بھی خرید لی ہوتی۔" وسیم کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

شبّو نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر لیا مسکرا کر وسیم کی طرف
دیکھا۔ اور بولی:
"خیال ہی نہ آیا۔ ورنہ سوٹ بنوانے کی جگہ ساڑھی ہی خرید لیتی۔
پیسے تو تھے میرے پاس —"

وسیم باہر چلا گیا۔ شبّو نے زنگالی سوٹ پر ہی اکتفا کیا۔
رات اس نے بڑے اہتمام سے بناؤ سنگار کیا۔ نئے زنگالی
سوٹ میں اس کا بے داغ حسن دمک رہا تھا۔ وسیم حسبِ عادت
شاعری پہ اتر آیا — کتنا پیار آ رہا تھا اسے شبّو پر — لیکن شبّو بھی
الجھی سی تھی۔ اس چھیڑ چھاڑ سے زیادہ لطف نہ لے سکی۔

وسیم نے اپنا نیلا سوٹ پہنا — کتنا وجیہہ لگتا تھا۔ وہ اس
سوٹ میں — ایک بار نوشی کی نظروں نے بلائیں ضرور لے لیں۔
دونوں فری کے ہاں پہنچے۔ وہ برآمدے ہی میں مل گئی۔ سرخ بنارسی ساڑھی
کا بھاری پلّو بار بار سنبھالتی وہ اُن کی طرف لپکی۔

"آداب وسیم بھائی — چلیے آپ ڈرائینگ روم میں — اسحاق
وہیں ہیں۔ شبّو تم — آؤ میرے ساتھ — !"

شبّو کا ہاتھ تھام کر اس نے وسیم کو ڈرائینگ روم میں بھیج دیا۔
"یہی کپڑے رہ گئے تھے آج پہننے کو" اس نے شاکی نظروں سے
شبّو کو دیکھا۔ اور پھر اسے اپنے ساتھ لے کر پچھلے کمرے کی طرف چلی گئی
کافی مہمان آ چکے تھے۔ وسیم ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ تو بہت

سی نظریں اس پر پڑیں۔ اسحاق بڑے تپاک سے ملا۔ اور پھر اس نے سب سے
وسیم کا تعارف کرایا۔

قریشی کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے وسیم نے بھرپور نظروں سے
سب کو دیکھا — شہر کا متموّل طبقہ مدعو تھا۔

ہنسی مذاق کا سلسلہ جو وسیم کی آمد سے کچھ دیر کے لیے منقطع ہوا
تھا۔ پھر سے چھڑ گیا۔ جلد ہی وسیم نے محسوس کیا کہ یہ انتہائی بے باک قسم کے
لوگوں کی تفریحی محفل ہے۔ ساجد کی بیوی نعیم کے ساتھ اخلاقی حدبندیوں کو
توڑ رہی تھی نعیم کی بیوی ناصر کے ساتھ — چمک دمک کے ساتھ ساتھ
جذباتی اتار چڑھاؤ کی بھی خوب نمائش ہو رہی تھی۔

وسیم ایسی محفلوں کا خوگر نہیں تھا۔ اخلاق کے ضابطوں کو توڑتی
ہوئی بے باکی سے اسے ذہنی کوفت ہو رہی تھی۔ وہ شبّو کو اس محفل میں لانا
نہیں چاہتا تھا۔ دل ہی دل میں فری کو دعائیں دے رہا تھا۔ جو شبّو کو دوسری
طرف لے گئی تھی۔

شبّو کو اندر آنے سے منع کرنے کے لیے وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ
عقبی دروازے کا پردہ ہٹا۔

اور

فری اندر داخل ہوئی۔

اس کے ساتھ شبّو بھی۔

"آئیے آئیے" کچھ آوازیں ابھریں۔

اور پھر پُراشتیاق نظریں دونوں کی طرف اُٹھ گئیں۔

وسیم نے بھی دیکھا۔

اس کا چہرہ اک لمحہ میں کئی رنگ بدل گیا۔

شبو نے زنگالی سوٹ کی جگہ تلّے کے بھاری بارڈروں والی سبز ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں لمبے لمبے آویزے تھے۔ اور ہاتھوں میں ڈھیر سی طلائی چوڑیاں۔ لجاتی شرمائی وہ فری کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

فری نے بڑے فخر سے اپنی بہن کا تعارف کرایا۔ حُسن کے پرستار اسے اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ اس کا معصوم حُسن اس زیبائش سے نائل بن گیا تھا۔

”کتنے خوش قسمت ہو اسحاق — قلوپطراؤں کے خاندان سے ناطہ جوڑ لیا ہے — معاف کیجئے بھابی آپ کی بہن آپ کا نمبر کاٹ گئیں۔“

کسی من چلے نے کہہ دیا۔ تعریفی جملے پر قہقہہ پڑا۔ اسحاق پھولا نہ سمایا فری بھی کھلکھلا کر داد کے طور پر ہنسی — لیکن وسیم کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔

شبو نے وسیم کی طرف دیکھا۔ سانس رکتی سی محسوس ہوئی۔ انتہائی غصے کی حالت میں بھی وسیم کبھی ایسا نظر نہ آیا تھا۔

باتیں ہوتی رہیں — معمول کے مطابق — لیکن یہ معمول وسیم کے لیے غیر معمولی تھی۔ آداب محفل کا خیال تھا۔ جو وہ گھٹا گھٹا بیٹھا رہا۔ ورنہ اس کا خون کھول رہا تھا۔

شبو سہمی سہمی سی بیٹھی تھی۔

فری اُٹھ کر باہر گئی۔ تو خالی جگہ دیکھ کر قریشی اس کے قریب آ بیٹھا شبو سمٹ کر ایک طرف ہو گئی۔ وہ بڑی بے باکی سے اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا — شبو چور نظروں سے وسیم کو دیکھتے ہوئے ہوں ہاں میں اس کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔

جوان و حسین رعنا وسیم کے پاس آ کر باتیں کرنے لگی۔

”رعنا بھی فواد کی بیوی ہے — کیا بگڑتا ہے باتیں کرنے سے۔“ شبو نے دل ہی دل میں کہا — شاید وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی اور اس دلیل سے احساسِ جرم کو کم کرنا چاہتی تھی۔

محفل رات گئے برخاست ہوئی۔

شبو جتنا عرصہ وہاں رہی اس کا سانس اٹکا ہی رہا۔

فری کی موٹر انھیں گھر پہنچا گئی۔

وسیم بالکل خاموش تھا۔ خاموشی ہی سے اس نے لباس تبدیل کیا۔ سگریٹ سلگایا اور بستر میں گھس گیا۔ شبو اس گمبھیر خاموشی سے الجھ رہی تھی۔ اس کی وجہ بھی جانتی تھی۔ اس لیے چاہتی تھی کہ وسیم کچھ نہ کچھ کہہ دے تاکہ وہ اپنی صفائی کی وجہ پیش کر سکے۔

وسیم نے کوئی بات نہیں کی۔ سگریٹ بجھا کر فرش پر پھینک دیا۔ شبو کپڑے تبدیل کر کے آ گئی۔ وسیم کی خاموشی اس کی ناراضگی کا کھلا ثبوت تھی۔ وہ ذہنی دباؤ سے گھٹن سی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اسے مخاطب کرنے کی جرأت نہ کر رہی تھی۔

وہ بھی بستر میں لیٹ گئی۔ بار بار کروٹیں بدل کر وہ وسیم کو مخاطب کرنے کے متعلق سوچتی رہی۔ وسیم ناراض ہو اور اسے نیند آ جائے یہ بھی تو ممکن نہ تھا اور پھر بات بھی تو کچھ ایسی تھی نا۔

"سو گئے؟" بڑی ہمت کر کے اس نے وسیم کا کندھا چھوا۔

"ہوں" وسیم کی گمبھیر آواز میں اثبات و نفی دونوں کی گنجائش تھی۔

"چپ چپ کیوں ہیں؟" اس نے بڑی جرأت سے بات چھیڑ دی۔

وہ چپ رہا۔

شبو اس کے پلنگ پر آ گئی۔ اس پر جھکتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"خفا ہو گئے ——؟" وہ مسکرائی۔

"نہیں ——" کتنا خنک لہجہ تھا۔ شبو کے دل میں تیر کی طرح چبھ گیا۔

"میں جانتی ہوں جی۔"

"کیا؟"

"آپ ناراض ہیں۔"

"اچھا تو پھر ——؟"

"دیکھئے —— خدا کی قسم —— فری نے زبردستی مجھے ساڑھی پہنا دی —— میں ——"

"کیا ہوا؟ —— چلو اسی طرح تمھاری بھاری بارڈروں والی ساڑھی پہننے کی خواہش تو پوری ہو گئی —— جانے کب سے سلگ رہی تھی دل میں —— یہاں تو پوری ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔"

ٹھنڈے ٹھنڈے لہجے میں طنزیہ جملے شبو کے جگر کے پار ہو گئے۔ آب دیدہ سی ہو کر گلوگیر آواز میں بولی۔ "آپ فری سے پوچھ سکتے

ہیں۔ میں کب پہنتی تھی ـــــ اسے بھی تو اپنے میکہ کا بھرم رکھنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں سے اس کا ملنا جلنا ہے۔ ان کی نظروں میں ہمارا وقار بلند رکھنے کے لیے تو اس نے میرے کپڑے تبدیل کروائے ـــــ"

شبو اپنی صفائی میں بہت کچھ کہتی رہی۔

وسیم سوچ میں ڈوبا رہا ـــــ شبو حال کو رو رہی تھی اور وسیم مستقبل کے خطرے کی گھنٹی سے متوحش تھا۔ اونچے طبقے کی دوڑ میں وہ بھلا کہاں ساتھ دے سکتے تھے۔ فری کے گھر کا ماحول اس کے ماحول سے کسی طور مناسبت نہ رکھتا تھا۔

لیکن شبو اور فری دونوں بہنیں تھیں۔ دونوں کے فطری پیار سے بھی اسے آگہی تھی۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے آئندہ کیا قدم اٹھانا ہے۔

"وسیم!" سوچ میں ڈوبے، وسیم پہ وہ بڑی اپنائیت سے جھک گئی۔

"ہوں۔"

"وعدہ کرتی ہوں ـــــ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔ آپ خفا نہ ہوں۔"

"شبو" وسیم خلافِ توقع بڑی نرمی اور ملائمت سے بولا۔ "آئندہ ایسا موقع ہی نہیں آئے گا۔ جو تم غلطی کر سکو۔"

"جی!" وہ شاید کچھ نہ سمجھ سکی۔

"شبو ـــــ زندگی کی اس دوڑ میں ہم فری اور اس کے طبقے کا

ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ لوگ ضرورت سے زیادہ ہی ماڈرن ہیں۔ ہماری اخلاقی تعلیمات مانع ہیں۔ مالی اعتبار سے بھی ان لوگوں سے میل جول رکھنے کی ہم میں استطاعت نہیں۔"

وسیم کہتا رہا۔ شبو سنتی رہی ـــــ لیکن دل میں وہ وسیم کی باتوں پر غصے سے اُبال سا اُٹھتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ کہہ تو کچھ نہ سکی ہاں غصہ روح کا بوجھ بن گیا۔

زندگی کی رنگینیوں کو گلے لگا لینے کی استطاعت اُن میں بے شک نہ تھی۔ لیکن ان رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فری کی وساطت سے تو مل سکتا تھا۔ اس سے گریز اپنے آپ پہ ظلم نہیں تھا کیا؟ ـــــ وسیم کے خیالات سے شبو کو قطعاً اختلاف تھا۔ لیکن مصلحتاً وہ خاموش رہی۔

"شبو" ملائمت سے ہر اونچ نیچ سمجھانے کے بعد وسیم نے سنگین سی آواز میں کہا۔ "میں تمھیں فری سے ملنے جُلنے سے منع نہیں کرتا لیکن آئندہ اس کے ہاں ایسی دعوتوں، پارٹیوں میں ہماری شمولیت نہیں ہو گی۔"

شبو کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صاف ظاہر تھا کہ اسے وسیم کی باتیں سخت ناگوار گزری ہیں۔ لیکن اس وقت کچھ کہنا بد مزگی اور شکر رنجی پیدا کرنے کے مترادف تھا۔

وہ بے دلی سے اُٹھی۔ بتی بند کی اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ بڑی دیر تک اسے نیند نہ آئی۔ زندگی کی کتنی حسین و رنگین ساعتوں پر وسیم نے سنگین سی پابندی لگا دی تھی۔ گھٹن کا احساس اس پر چھانے لگا۔

فری اور اس میں صرف دو سال کا فرق تھا۔ شکل وصورت بھی اس نے
فری سے یقیناً اچھی پائی تھی۔

لیکن

نصیب!

کہاں فری اور کہاں وہ

وہ اپنا موازنہ فری سے کرنے لگی۔ جوں جوں سوچتی گئی۔ اپنی ذات
کے لیے جذبۂ ترحم بڑھتا گیا۔ اپنے نصیب کو کوستے ہوئے جانے کب
اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح وسیم حسبِ معمول دفتر چلا گیا۔ شبو خیالات کی ادھیڑبن میں الجھی
رہی۔ اپنے آپ سے کتنی ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔

اور

وسیم!

وسیم کے لیے اس کے دل میں باغیانہ خیالات سر اٹھانے لگے
تھے۔

فری کے ہاں اس رات شبو ان کے بہت سے ملنے جلنے والوں سے
متعارف ہوئی تھی۔ سبھی اس کے حسن سے مرعوب ہوئے تھے۔ ساڑھی اور
نئی چوڑیوں نے اس کی مالی حالت کو ڈھانپ کر ملنے والوں کے ذہن پر
اچھا نقش چھوڑا تھا۔ سبھی نے اس سے روابط قائم کرنے کی خواہش
ظاہر کی تھی۔ فرید تو ایک ہی ملاقات میں اس سے یوں گھل مل جانا چاہتا
تھا۔ جیسے مدتوں کی جان پہچان ہو۔ ان کے ماحول میں یہ بات معیوب بھی
تو نہ تھی۔ اس کی اپنی بیوی باسط کی کتنی گہری دوست تھی۔

فری کی دعوت کو ابھی ہفتہ عشرہ ہی گزرا تھا کہ فرید نے محض شبو کی
خاطر اک شاندار دعوت کا اہتمام کر ڈالا۔

"مہمان خصوصی مسز وسیم ہوں گی۔" فرید فری کو دعوت نامہ دیتے ہوئے
بولا ——

"اچھا جی —— تو ہم طفیلی ہوں گے۔" فری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

اس کی بہن کو فرید نے اتنا بڑا اعزاز بخشا تھا۔ یہ فری کے لیے خوشی اور فخر ہی کی تو بات تھی۔

"یہی سمجھ لیجئے" فرید بھی جواباً ہنس دیا۔

کچھ دیر دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جانے سے پہلے فرید نے شبو کے گھر کا پتہ پوچھا۔ فری لمحہ بھر کو گھبرائی۔

"میں اپنی گاڑی ان کے لیے بھیج دوں گا۔"

"نہیں، نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم انھیں ساتھ لیتے آئیں گے آپ تکلیف نہ کریں۔"

"تکلیف کیسی؟ ان کے آنے سے مجھے بے پناہ خوشی ہوگی بہت اچھی ہیں۔ آپ کی بہن۔ بڑی معصوم سی لگتی ہیں۔ یقین مانیئے۔ آپ سے چھوٹی دکھائی دیتی ہیں۔"

"مجھ سے صرف دو سال بڑی ہیں۔ ویسے ان کی شادی کو تین چار سال ہو چکے ہیں ___"

فرید کے جانے کے بعد فری نے گاڑی نکلوائی۔ اور خوشی خوشی شبو کے ہاں دعوت کا کہنے کو چل دی۔

"ایک ہی ملاقات میں جادو کر دیا لوگوں پر" فری نے ہنستے ہوئے شبو سے کہا۔ "جو بھی ملتا ہے۔ تعریفوں سے زمین آسمان ایک کر دیتا ہے"

شبو اس مژدہ جانفزا پر مسکرا تک نہ سکی۔

فری نے فرید کی دعوت کا بتایا ___ "محض تمھاری خاطر انھوں نے

یہ دعوت دی ہے ___ بہت اچھا آدمی ہے فرید۔ لاکھوں کا کاروبار ہے"

فری فرید کے بارے میں شبو کو بتاتی رہی۔ لیکن شبو پریشان سی نظر آنے لگی۔

"تم مہمان خصوصی ہو کل رات۔"

"میں خواہ مخواہ؟"

"اللہ قسم۔ فرید تو بس ___ کیا بتاؤں" وہ شرارت سے شبو کو دیکھ کر ہنسی۔

"ایسی باتیں نہ کرو فری۔"

"باتوں سے کیا بگڑ جانا ہے۔"

"تمھارا کچھ نہیں ___ میرا تو ___"

"کیا بات ہے شبو۔ پریشان کیوں ہو؟" فری شبو کی آب دیدہ نظروں سے گھبرا گئی۔

"کچھ نہیں۔ تم یہ دعوت نامہ واپس ہی لے جاؤ۔"

"کیوں؟"

"وسیم بُرا مان جائیں گے۔"

"وسیم بُرا کیوں مان جائیں گے۔"

"فری!" شبو نے چپکے سے اپنی بھیگی آنکھوں کے گوشے انگلی کی پور سے صاف کیئے۔ "وہ اس میل جول کے خلاف ہیں۔"

"کیوں؟"

اس کیوں کا جواب شبو نے وسیم کے دلائل سے دیا۔ پچھلی دعوت کے بعد جو کچھ ہوا تھا سب کچھ کہہ سنایا۔

فری کی طبع نازک پر یہ اتنا گراں گزرا کہ اس کے گال تمتما اٹھے۔ ماتھے پر کئی بل پڑ گئے۔

"ایسی تنگ نظری بھی کیا"

"اپنا اپنا خیال ہے فری"

"اور تم اپنے جذبات، اپنی خوشیاں اس خیال کی بھینٹ چڑھا رہی ہو"

"تو پھر کیا کروں" بے رنگ سا تبسم شبو کے ہونٹوں پر آگیا۔

فری چپ ہوگئی۔ شاید "کیا کروں" کا عمل سوچ رہی تھی۔

"کتنی بری بات ہے شبو" کافی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولی۔

شبو اک آہ سرد کھینچ کر رہ گئی۔

"میں فریدہ کو کیا کہوں گی ___ تمہارے اعزاز ہی میں تو دعوت دی جا رہی ہے ___"

"طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دینا"

"میرے خیال میں قریشی اور نوابی بھی تمہیں اپنے ہاں بلانے والے ہیں"

کس کس سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کروں گی ___ کیا خیال کریں گے وہ لوگ ___ اتنے قدامت پرست ہو تم ___ میرا مذاق بن جائے گا ___ تم وسیم کو قائل کرنا ___ ؟ ہر بات میں اس کی ہاں میں ملاتی جاتی ہو ___ یہ

پر چڑھا رکھا ہے اسے"

شبو مسکرا دی۔ لیکن پھر جلدی سنجیدہ ہو گئی "میں انہیں قائل نہیں کر سکتی فری ___ ان کی طبیعت سے واقف ہوں ___ مجھے میرے حال پر ہی چھوڑ دو ___ تمہارے طبقے کی دوڑ میں ہم ساتھ دینے کی ہمت و استطاعت نہیں رکھتے ___"

شبو کی بات احساس کمتری کا بین ثبوت تھی۔ فری آخر اس کی بہن تھی۔ اس کا دل اس بات پر دکھ گیا۔ کاش وہ کسی صورت شبو کو اپنے برابر کر سکتی۔

فری باتوں سے شبو کا دل بہلاتی رہی۔ لیکن یہ بہلاوے کسی کام نہ آ سکے۔ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی۔

"میں وسیم بھائی سے خود بات کروں گی" فری نے آخر کہا۔

"نہ، نہ، فری" شبو گھبرا کر ایک دم بولی۔

"کھا تو نہ جائیں گے ___ بات تو کرنے دو ___ ابتدا ہی سے اس طرح جھک گئیں۔ تو کسی دن مجھ سے ملنا بھی چھڑا دیں گے ___ آج میرے ملنے والوں سے اجتناب ہے کل مجھ سے بھی ہوگا ___ یہ بھی کوئی بات ہے بھلا ___؟"

"نہیں فری ___ تمہارے ہاں آنے جانے پر انہوں نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ صرف ایسی دعوتوں اور تفریحی محفلوں میں جانے سے منع کیا ہے"

"ان دعوتوں میں جیسے تم ہی تو ایک عورت ہوتی ہو۔ رعنا کو دیکھا تھا اور وہ شیلا ___ خود فرید کی بیوی ___ یہ تو میرے خیال میں عورتیں ہی نہیں

میں بھلا تو سب سے گھُٹم گھُلا ملتی ہوں۔ کوئی اٹھا کر تو نہیں لے جاتا — آتنے تنگ نظر ہیں وسیم بھائی — میرا تو خون کھولنے لگا ہے۔ تم جانے کیسے اتنے سال سے اُن سے نباہ کیے آ رہی ہو — میں ہوتی تو اللہ قسم — ایک دن بین کر کے چلی آتی —"

شبو اس کی باتوں پر پھیکی پھیکی ہنسی ہنستی رہی۔

شبو نے فری کو کھانے پر روک لیا۔ وہ بھی ذرا وسیم کو دلائل سے قائل کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے وہیں ٹھہر گئی۔

وسیم آیا۔ فری کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ اسحاق کے متعلق پوچھتا رہا۔

شبو کے منع کرنے کے باوجود فری نے دعوت کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ دلائل سے مرعوب کر کے وسیم کو شاید وسیع النظر بنانا چاہتی تھی۔

وسیم کے جذبات اس کے چہرے سے مترشح تھے۔ شبو کا دم الجھنے لگا۔

"فری —" وہ مسکرایا — "یہ چاول ہمارے کھانے کے نہیں ہیں۔ ایسے پروگرام تم اپنے تک ہی محدود رکھا کرو بھئی — ہمیں اپنی اور اپنے ملنے والوں کی محفلوں میں شرکت سے معاف ہی رکھو۔"

فری کو بُرا تو بہت لگا۔ اس نے کچھ کہنے کو لب بھی کھولے لیکن شبو نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

بات ٹل گئی۔

فری اپنے گھر چلی گئی۔

لیکن

شبو کے ذہن کا بوجھ اور بڑھ گیا — وسیم کی تنگ نظری کا جیسے فری نے اسے احساس دلا دیا تھا۔ وہ اپنے جیتے جاگتے جذبات کا گلا وسیم کی خاطر گھونٹ رہی تھی۔ یہ سراسر زیادتی تھی۔ ظلم تھا۔

وسیم کے خلاف باغیانہ خیالات جنم تو پہلے ہی لے چکے تھے، فری کی باتوں سے ان کی نشو و نما بڑی سُرعت سے ہونے لگی۔

موسم پر بڑا نکھار تھا۔ ہواؤں میں شراب کی سی مستی تھی۔ لہلہاتا سبزہ جھومتے پھول اور پھیلے پھیلے درختوں کی لطیف سرسراہٹیں فضا کے حسن کو جلا بخش رہی تھیں۔

فری اور شبو چمن میں رنگ برنگی کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ بینا زیب ہی فری کے لائے ہوئے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔

شبو نے سادہ سے گلابی کپڑے پہن رکھے تھے۔ لیکن موسم اور سبزے کی مناسبت سے یہ ہلکا گلابی رنگ نگاہوں کو پُرکیف تاثر دے رہا تھا۔

فری شبو کو اس رات دعوت کے قصے سنا رہی تھی۔

"دعوت بڑی شاندار تھی۔ گانے بجانے کا بھی پروگرام تھا۔ اللہ قسم شبو لطف آ گیا۔ تمہارے نہ جانے سے فرید بیچارے بڑے مایوس ہوئے۔ کئی بار پوچھا —"

"میرے جانے نہ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے — جان نہ پہچان —" شبو نے ناگواری کا اظہار کیا۔

"ان لوگوں کے دستور اور ہیں شبو — بُرا ماننے کی کیا بات ہے، تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی۔ تو فخر سے پھولی نہ سماتی —"

"یہ بھی کوئی شرافت ہے بھلا —؟"

"اے ہے جانے دو شبو — شرافت لیے بیٹھی رہو تم — بُری بات بھی کیا ہے — خلوص کو مشتبہ نظروں سے دیکھا ہی کیوں جائے۔ ہر بات کو اُلٹی طرف نہ لے جایا کرو — وسیم کی تنگ نظری کا تم پر بھی اثر ہو گیا ہے۔"

شبو نے کچھ نہیں کہا۔ ہاں اس کا ذہن متلاطم ضرور ہو گیا۔

ملازم چائے لے کر آ گیا۔ دونوں کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

شبو چائے بنانے لگی۔

موٹر کی آواز پہ دونوں نے کوٹھی کی بیرونی سڑک کی طرف دیکھا۔

بادامی موٹر گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔

"عمر دراز" فری مسکرا کر بولی۔

"کون ہے؟" شبو نے چائے کی پیالی فری کی طرف بڑھائی۔

"فرید" فری ہنسی "ابھی انہی کا ذکر ہو رہا تھا نا؟"

فرید کے نام پر جانے کیوں شبو کا دل دھڑک اٹھا — اس کا جی چاہا۔ اٹھ کر اندر چلی جائے۔ وہ اسے ملنے سے کترا رہی تھی۔ وسیم کا ڈر تھا۔ یا — یا اپنے دل میں کسی لاشعوری جرم کا احساس — بہرحال

وہ اس کا سامنا نہ کرنا چاہتی تھی۔

فرید گاڑی سے نکلا — انھیں چمن میں دیکھ کر اسی طرف آ گیا۔

"ہلو!" دور ہی سے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے مسکرایا۔

فری نے جواباً ہاتھ ہلا کر خوش آمدید کہی۔

شنّو گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگی۔

"آہا — مسز وسیم — کہیئے کیا حال ہے — اچھی تو ہیں اب —؟"

"جی — شکریہ"

"آپ تو عید کا چاند ہی ہو گئیں۔ اس دن کے بعد نظر ہی نہ آئیں"

"بیٹھیے!" فری نے فرید سے کہا۔

وہ کرسی شنّو کے قریب گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"آپ اس دن ہمارے ہاں آئی کیوں نہیں؟" فرید نے پھر شنّو کو مخاطب کیا۔

"طبیعت اچھی نہ تھی" شنّو نے دھیرے سے کہا۔

"جھوٹ" فری کھلکھلا کر ہنس دی۔

شنّو نے فری کو گھور کر دیکھا۔

"فرید صاحب — طبیعت کی خرابی کا بہانہ تھا"

"واقعی؟"

"جی ہاں"

"ہمارے ہاں آنا گوارا نہ تھا؟"

"جی نہیں — فری —" شنّو نے مداخلت کی —

"انھیں تو شاید گوارا تھا۔ ہاں ان کے میاں کو گوارا نہیں تھا" فری چہک کر بولی۔

"کیوں؟" فرید نے حیرت آمیز نظروں سے فری کو دیکھا۔

"انھیں اپنی بیگم کا آپ سب لوگوں سے ملنا پسند نہیں"

"فری —!" شنّو نے پھر گھورا۔

"سچی بات کہہ دینے میں کیا حرج ہے"

فرید مایوس سا نظر آنے لگا۔

"ہمیں اتنا ہی گیا گزرا سمجھتے ہیں وسیم صاحب — بڑا افسوس ہوا مجھے تو —"

"گیا گزرا تو نہیں — ویسے ہی وہ کچھ عجیب مزاج کے آدمی ہیں۔ بڑے قدامت پسند ہیں — کچھ تنگ نظر بھی" فری شرارت سے شنّو کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"اوہو" فرید افسوس کا اظہار کرنے لگا "یہ تو مسز وسیم پر سراسر زیادتی ہے"

"انھیں کا حوصلہ ہے جو ان سے نباہ کیے جا رہی ہیں — فرید صاحب — میں تو تصوّر بھی نہیں کر سکتی ایسی زندگی کا — اشارۂ ابرو پہ چلاتے ہیں۔ ذرا ادھر سے ادھر ہوئی نہیں۔ کہ جناب کا مزاج بگڑا نہیں"

فرید بڑے انہماک سے سنتے ہوئے شبو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کی نظروں میں رحم، ہمدردی اور اللہ جانے کیا کچھ تھا۔ شبو کو وسیم کا یوں موضوع بن جانا اچھا نہ لگا — آخر ان کی ذاتی زندگی میں ان لوگوں کو دخل دینے کا کیا حق تھا۔ اسے فری پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ یہ نہ سمجھ کر وہ اگر اپنے دل کے آبلے اس کے سامنے پھوڑ لیتی تھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ یہ ان زخموں کو ہر ایک کو دکھاتی پھرے۔

فرید کو چائے پیش کی گئی۔ شبو گفتگو کا موضوع بدلنا چاہتی تھی۔ لیکن فرید کے دل میں تو اس کے لیے جیسے زمانے بھر کی ہمدردی اور رحم کا جذبہ بھر گیا تھا۔ ہر پھر کر بات وسیم اور شبو کے متعلق ہی ہونے لگتی۔

"ایسی نایاب سی بیوی — اور اس کے ساتھ ایسا سلوک۔ حیران ہوں کہ بعض لوگ دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنا کیوں ضروری نہیں سمجھتے۔ آزادی ہر ایک کا پیدائشی حق ہے — جہاں تک میرا خیال ہے ایسے لوگوں کو اپنی بیویوں پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اس عدم اعتمادی کی وجہ خود اُن کا احساس کمتری ہوتا ہے۔"

فرید نے اک لمبی تقریر کر ڈالی۔

"یہ سچ کہا آپ نے فرید صاحب —"

"لیکن مسٹر وسیم دیکھنے میں تو بہت اچھے ہیں — میرا تو خیال تھا مزاج بھی بڑا شگفتہ ہے۔ ایسا آدمی کو احساس کمتری کا شکار ہونا تو نہیں چاہیے کیوں مسز وسیم؟"

"آپ کسی اور موضوع پہ بات نہیں کر سکتے؟" شبو نے سنجیدگی سے کہا! فری مسکرا دی اور فرید اسے حیران حیران سی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟"

للی کا کھلونا ٹوٹ گیا — وہ ایک دم چیخی — فرید کی بات کا جواب دیے بغیر وہ بچی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

فرید شام تک وہیں رہا۔ شبو کے ساتھ تو جیسے وہ چپک کر رہ گیا۔ شبو کے اظہارِ ناپسندیدگی کے باوجود وہ ہمدردی جتاتا رہا۔

"آپ کو تو سوسائٹی کی روح رواں ہونا چاہیے تھا۔"

"آپ تو محفلوں کی جان ہو سکتی ہیں۔"

"آپ کی دوستی کا اعزاز پانے والا دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوگا۔"

"کلی کی طرح گھٹی گھٹی نہ رہا کریں، پھول کی طرح کھل جائیں۔"

شبو رات گھر پہنچی تو اس پر اداسیوں کا بوجھل سکوت طاری تھا۔

وسیم سے تو اس کا بات کرنے کو جی نہ چاہا۔

اور

رات جب وہ سونے کے لیے پلنگ پر لیٹی تو ان ساری باتوں کی صدائے بازگشت نے اسے بے چین کر دیا۔ جو فرید نے کہی تھیں — وہ سچ ہی کہتا تھا۔

وہ سوچتی رہی۔

بے چینی سے سوچتی رہی۔

اپنی ذات پر وسیم کے بے انتہا ظلموں کے محاسبے میں غرق رہی۔

بڑی تلخ سی نظروں سے اس نے ساتھ والے پلنگ پر سوئے وسیم کو دیکھا۔

"جن کے پاس دولت نہیں ہوتی ـــ وہ شرافت کے ٹھیکے دار بن بیٹھتے ہیں۔" قہر آلود نظروں سے وسیم کو دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

اور

کروٹ اس سے مخالف سمت موڑلی۔

وسیم شبو کے مزاج کی تدریجی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ دکھ کا جان لیوا احساس ہر وقت اس کے اعصاب پر مسلط رہتا۔ شبو جذباتی سی عورت تھی۔ زندگی کے رنگ روپ میں بہت جلد متاثر ہو جانے والی ـــ اور جب سے فری کی شادی ہوئی تھی۔ ہر رنگ روپ اس کی زندگی پر براہِ راست اثر انداز ہو رہے تھے۔

وسیم سب کچھ جانتا تھا لیکن سمجھ نہیں پاتا تھا۔ کہ کیا کرے۔

اپنی اور اسحاق کی مالی حالت میں جو تفاوت تھا۔ اسے شبو تو نظر انداز کر سکتی تھی۔ لیکن وہ کیوں کر بھول جاتا۔ اسحاق کے ہاں زندگی مسرتوں کا بھرپور قہقہہ تھی۔

اور

اس کے ہاں

ذہنی اور جسمانی کاوشوں کے باوجود حیات کے لبوں پر تبسم کی لکیریں

بکھیرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

دونوں اکثر خاموش رہتے۔ سوچوں کے جال میں الجھے الجھے — گو دونوں کی سوچوں کا زاویہ الگ الگ تھا۔

شبّو کے کانوں میں فریدہ کی باتوں کی بازگشت ہوتی اور وسیم اپنی بے جان سی خانگی زندگی کے بارے میں الجھا رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ عجیب عجیب سی باتیں سوچنے لگتا۔ اس کا جی چاہتا۔ رشوت لینا شروع کر دے۔ جس محکمے میں وہ ملازم تھا۔ رشوت چلتی تو خوب تھی لیکن بچپن ہی سے پارسا ماں نے اس کی ذہنی اٹھان کچھ اس طریق سے کی تھی۔ کہ حلال و حرام کا فرق جانتا تھا۔ لیکن اب حالات کو دیکھتے ہوئے کتنی بار اس کا دل چاہا کہ رشوت لینا شروع کر دے۔ شبّو اب بھی دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لیتا ہوا درد تھی۔ یہ درد اسے روزِ اوّل ہی کی طرح محبوب تھا۔ اس کے لیے وہ کیا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فری کی طرح اسے بھی دولت کے سنہری لبادوں میں لپیٹ دینا چاہتا تھا۔

لیکن

وہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھا سکا۔ جو اس کے اصولوں کے منافی ہو۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ شبّو کے رویّے میں بڑے ہی غیر محسوس طریق سے ٹھنڈک اور سرد مہری اترتی آ رہی تھی۔ اس کے پیار کا والہانہ پن — اس کا جذبۂ خدمت — اس کی وسیم کے لیے بے قراری خنکی کی تہ تلے دب رہے تھے۔

چھٹی کا دن تھا۔ شبّو وسیم کو ناشتہ دے کر فری کے ہاں جانے کو

تیار ہو رہی تھی۔ فری کی طبیعت اچھی نہ تھی اور اس نے صبح ہی صبح گاڑی بھیج دی تھی۔

روحانی اور ذہنی بوجھ سے وسیم بھی کچھ دل برداشتہ سا نظر آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا — شبّو فری کے ہاں نہ جائے — چھٹی کا دن پھر انہی خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بن جائے۔ جس طرح آج سے کچھ مدت پہلے ہوا کرتا تھا۔

وہ شبّو کو جانے سے منع بھی کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ پیار میں تو وہ جبر کا قائل ہی نہیں تھا۔

شبّو چلی گئی۔

اور

اس کی روح حال اور مستقبل کی ویرانیوں میں ڈوب گئی۔

فری کی طبیعت تو کچھ ایسی خراب نہ تھی۔ شبّو کو بلانے کا محض بہانہ تھا وہ زندگی کی ہما ہمی میں شبّو کو شریک رکھنے کی خواہش مند تھی۔ شبّو کے اپنے وسائل محدود تھے تو کیا ہوا۔ فری اس کی ذہنی خوشیوں کے مواقع فراہم کرنے کی تو اہل تھی۔

"آج ہمارا پکچر کا پروگرام تھا —" فری نے کہا "میں نے صبح ہی صبح بلوا بھیجا۔ شام کو بلاتی۔ تو وسیم کو شک گزرتا —"

شبّو کے دل نے ملامت تو کی لیکن وہ آزمائش کے اس دور میں ثابت قدم نہ رہ سکی۔

فلم پر اور بھی کئی لوگ مدعو تھے۔ فرید پیش پیش تھا۔ فکرِ فردا سے
بے پروا یہ لوگ کتنے سکون سے فلم دیکھ رہے تھے۔ شبّو کا ضمیر بار بار
ملامت کر رہا تھا لیکن وہ ڈھلانی چٹان پر پھسلتی جا رہی تھی — نہ چاہنے
کے باوجود بھی اسے فرید کا ساتھ کچھ اچھا اچھا لگنے لگا تھا۔

فلم کے بعد فرید، فری، اسحاق اور شبّو کو اپنے گھر لے گیا۔
اس کی بیوی کلب جانے کو تیار ہو چکی تھی۔ نہ اس نے بیوی کے جانے
پر اعتراض کیا۔ نہ بیوی نے شوہر کے ساتھ عورتوں کو دیکھ کر کچھ پوچھا۔
کچھ دیر وہ رسمی تکلف کے لیے ان کے پاس بیٹھی اور پھر معذرت
کر کے چل دی۔ شبّو میاں بیوی کی فراخ دلی پر حیران سی ہوئی — اور پھر لاشعوری
طور پر وہ اپنا اور وسیم کا موازنہ ان سے کرنے لگی۔

آج اسے فرید سے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی — وسیم کا
زیرِ موضوع آنا بھی برا نہ لگا۔ بلکہ آج اس نے دبے دبے لفظوں میں اپنے
نصیب کو کوس بھی ڈالا —

زندگی تو ان لوگوں کی تھی۔

کاش!

وہ بھی زندگی کی ان گہما گہمیوں کو یوں گلے لگا سکتی۔

رات کا کھانا سب نے فری کے ہاں کھایا۔ فرید رات گئے تک
ان کے ساتھ رہا — آج وہ کچھ بڑھ گیا تھا۔ ہمدردیوں نے کچھ اور رنگ
بدل لیا تھا۔

"پھر کب ملیں گی؟" شبّو کے گھر جانے سے پہلے اس نے پوچھا۔

"دو چار دن بعد پھر بلا بھیجوں گی۔" فری نے جواب دیا۔ "یوں تو ان
کے میاں صاحب آنے نہیں دیتے — اسی طرح سہی — بہانے بنانے
میں خوب ماہر ہوں۔"

شبّو کے لبوں پر جھکتی ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی — "تمہارے ہاں آنے
پر کوئی پابندی نہیں فری۔"

"پھر تو ہم یہیں ڈیرے ڈال لیں — مل تو لیا کریں گے آپ سے
— سچ کہتا ہوں۔ آپ کے حالات جان کر مجھے بڑی ذہنی کوفت ہوئی ہے۔"

"شکریہ" شبّو پھر مسکرائی۔

"آپ ذہن پر بار نہ رکھا کریں۔ ہفتے عشرے میں اسی طرح کے پروگراموں
میں حصہ لیتی رہا کریں — صحت بھی اچھی رہے گی — ورنہ — اس طرح
تو انسان گھٹ کے مر جائے۔"

شبّو جب گھر پہنچی تو گیارہ بجنے والے تھے۔ ملازمہ نے دروازہ
کھولا۔ سب سو چکے تھے۔

دبے قدموں سے وہ اپنے کمرے میں آئی۔ آج دن بڑا پرکیف گزرا
تھا۔ حواس پر نشہ سا طاری تھا۔ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔

کمرے میں چھوٹا سا لیمپ روشن تھا۔ بینا اس کے پلنگ پر
سوئی ہوئی تھی۔ وسیم بھی کروٹ بدلے سو رہا تھا۔

اس نے بچی اور وسیم کو دیکھا۔

کچھ کھٹکی۔

آگے بڑھی۔

بچی کے گالوں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ شاید رو رو کر سوئی تھی ۔۔۔

شبو کا خمار ٹوٹنے لگا۔

وسیم کی طرف دیکھا اس نے رومال سے ماتھا باندھ رکھا تھا۔ اُلجھی اُلجھی بے ترتیب لٹیں کشادہ پیشانی پر پڑی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر فرشتوں کا سا تقدس لیے وہ بے چین سی نیند سویا ہوا تھا۔

شبو کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے ہواؤں کے دوش پر اُڑتی ہوئی وہ ایک دم چکر کھاتی نیچے آ گری ہو ۔۔۔ وہ پلنگ کی پائنتی کی طرف کھڑی وسیم کو دیکھتی رہی۔

دھند چھٹنے لگی۔ خمار ٹوٹنے لگا۔ اور حواس پر چھایا ہوا نشہ اُتر گیا۔ شبو کے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھنے لگے۔ وہ زندگی کی متعینہ راہ سے بھٹکتی جا رہی تھی۔ اس کا ضمیر چیخ اٹھا۔ وہ ایک شوہر کی بیوی اور ایک بچی کی ماں تھی۔ لیکن آج آج ایک غیر آدمی کے ساتھ پورا دن گزار کر وہ مسرت کے بھرپور احساس سے مغلوب ہو ہو گئی تھی۔

جرم کا احساس اتنا شدید تھا۔ کہ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

وسیم

اپنے محبوب وسیم سے وہ کس قدر غافل ہو گئی تھی۔ کتنی بے اعتنائی برت رہی تھی۔ اس کا جذبۂ محبت عود کر آیا۔ اس کی وفا جاگ اٹھی۔ بے تاب ہو کر بڑھی پلنگ کے قریب دو زانو ہو کر اس نے اپنا سر وسیم کے تکیے پر رکھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

وسیم چونک گیا۔ آنکھیں کھولیں۔ چند لمحوں کے بعد وہ پوری طرح بیدار ہو کر شبو کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس کے ہاتھ پر سر رکھے اس کا بازو بڑے پیار سے سہلا رہی تھی۔

حیرانگی سے اس نے شبو کو دیکھا۔ کچھ بھی تو نہ سمجھ سکا۔ اپنا ہاتھ کھینچا شبو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور مسحور سی پلنگ کی پٹی پہ بیٹھے ہوئے اس پر جھک گئی۔

"آ گئیں؟" وسیم اس کے خلافِ معمول، خلافِ توقع رویے پر اب تک حیران تھا۔

"وسیم" وہ جذبات سے بھرپور آواز میں بولی۔

"آج میں کیسے یاد آ گیا؟" وسیم نے افسردگی سے کہا۔

"میں آپ کو بھولی کب تھی۔" وہ اور جھک گئی۔

"مجھے چھوڑو ۔۔۔ تم تو اپنے آپ کو بھی بھولتی جا رہی ہو" وسیم نے اداس سی آواز میں طنز کیا۔

"وسیم" اس نے اپنا سر اس کی چھاتی پر رکھ دیا۔

اور

سسک سسک کر رونے لگی۔

آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"شبو" بڑی ہی دیر بعد وسیم جیسے اپنے حواس میں آیا۔ "رو کیوں رہی ہو؟"

شبو کچھ نہ بولی۔ روٹھ سی گئی۔ شاید مجرم دل میں پھیلے ہوئے گناہوں کی تاریکیوں کو دھونے کا عزم تھا۔

وسیم کا دل بھی دکھنے لگا۔ شبو سے آج کل وہ بھی تو سرد مہری برت رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں کو اپنی سرد مہری کا رد عمل سمجھ کر اس کے دل میں شبو کے لیے طوفانی پیار کے جذبات مچلنے لگے۔

لیکن شبو کا تو دکھ ہی اور تھا ــــ وسیم کیا جانتا تھا۔

بیچارہ وسیم!

شبو نے فری کے ماحول سے قطع تعلق کرنے کا عزم کر لیا۔ اپنے گرد اس نے فرضی حصار سا کھڑا کر لیا۔ فری کے علاوہ وہ اس کے کسی ملنے والے سے راہ و رسم نہ بڑھائے گی ــ ان کا سامنا ہی نہیں کرے گی۔ اس عزم کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ وہ فری کے ہاں اکیلی نہ جاتی۔ وسیم کو ساتھ ضرور لے جاتی ــــ اتنی دیر ہی بیٹھتی جتنی دیر وسیم چاہتا۔

لیکن

کھوکھلی بنیادیں اتنی وزنی دیواروں کا بوجھ سہارنے کی متحمل کہاں تک ہو سکتی تھیں۔ جذبات پر جبر کی سلیں گام گام پر الجھی آزمائشوں سے سرکنے لگیں۔

گھر میں طبیعت اُچاٹ اچاٹ رہنے لگی۔ سانس کی بیماری نے تو اسے چڑچڑا بنا دیا۔

وسیم کی خوشیوں کا چاند جو چند دنوں کے لیے چمکا تھا۔ پھر بادلوں

کی اوٹ میں چھپنے لگا۔ گھر پہ پھر اک بار وہی جامد سناٹا چھانے لگا۔
شبّو کے لیے یہ دور بڑا صبر آزما تھا۔ کبھی تو اس کے منجمد جذبات
جاگ اٹھتے۔ وسیم سے ابدی وفا کا خیال بدن پر رعشہ طاری کر دیتا اور کبھی!
اپنے ماحول سے فرار پانے کے لیے ترکیبیں سوچتی۔
متضاد خیالات اسے پریشان سے پریشان تر کیے گئے۔ بعض
اوقات تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اپنا ذہنی توازن کھو رہی ہے۔
وسیم کے چند دوست آئے ہوئے تھے ـــ شبّو نے چائے
بنا کر بھجوا دی اور صحن میں بیٹھک کے دروازے کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر
اخبار دیکھنے لگی۔
اخبار میں دل چسپی کی کوئی چیز نہ پا کر اس نے پرچہ میز پر رکھ دیا۔ بیٹھک
میں چائے پیتے ہوئے وہ لوگ آپس میں باتوں میں مشغول تھے۔ شبّو کا دھیان
ان کی باتوں کی طرف گیا۔
لیکن جلد ہی اس نے کراہت کے سے احساس کے ساتھ منہ بنایا۔
ان دوستوں کی باتوں میں تھا ہی کیا۔
وہی تنخواہوں کی کمی اور مہنگائی کا رونا ـــ اخراجات کی زیادتی۔
گھسی ہوئی پتلونوں، پھٹے پرانے کالروں اور ادھڑے ہوئے جوتوں کا قصہ
اس سے زیادہ بڑھے تو اونچے طبقے پر طنز کی بارش کر دی۔ انھیں کوس کوس
کر دل کو ٹھنڈا کیا۔
شبّو نے وسیم کے لیے دل میں سبکی سی محسوس کی جو دوستوں میں گھرا بیٹھا

ایسی پست پست باتیں کر رہا تھا۔ اسحاق کے بھی تو دوست آتے ہیں۔ کیا
پانی کی طرح رواں قہقہے ـــ بلند مذاق ـــ سوئٹزرلینڈ کی برفوں کے قصے
ہانگ کانگ کی بندرگاہ پہ ڈوبتے سورج کے حسین باتیں ـــ پیرس
کی روشنیوں کا ذکر ـــ لندن اور نیویارک کی تفریحی جگہوں کے تذکرے
اس موازنے نے طبیعت کو کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا ـــ وہ
بے قراری سے صحن میں ٹہلنے لگی۔
"بیٹی ذرا ـــ پانی دینا" ساس کی نحیف آواز آئی ـــ اس کا جی
چاہا۔ پانی کی جگہ زہر دے کر اس بڑھیا کا خاتمہ کر دے ـــ مہینہ بھر سے
بیمار پڑی ذہن کا بار بنی ہوئی تھی۔
ساس نے پھر پانی مانگا۔ باورچی خانے میں بیٹھی بوڑھی ملازمہ نے
شبّو کی توجہ ادھر دلائی۔
وہ بڑبڑاتی ہوئی پانی کا گلاس لے کر اندر چلی گئی۔ کمرے میں پلنگ
پر پڑی ہوئی ساس کھانس رہی تھی۔ کھاؤں کھاؤں کی آواز اس کی سماعت
پر گراں تھی۔ اڑتی ہوئی دوائیوں کی بدبو سے اس نے سانس کھینچ لی۔
شام تک اس کی طبیعت حد سے زیادہ پریشان تھی۔ وہ چھت
پر چلی گئی ـــ بے تابانہ پھرتے ہوئے وہ اپنے منتشر حواس بحال کرنے
کی کوشش کرنے لگی۔ نہ جانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کیا چاہتی
تھی۔ وہ کیا کر گزرنے والی تھی۔ بے بس ہو کر اس نے رونا شروع کر دیا۔
وہ دیر تک روتی رہی۔

جب نیچے اُتری تو شدتِ گریہ سے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ آنکھیں سُوج گئی تھیں۔

وسیم نے اسے صحن سے گزرتے دیکھا۔ لال لال چہرہ سوجی سوجی آنکھیں اور بھیگے بھیگے گال اس نے نظر بھر کر دیکھے۔

شبو پر یہ دورہ پہلے بھی کئی بار پڑ چکا تھا۔ ایک طویل آہ کھینچ کر وہ ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ کتنی دکھی ہو رہی تھی آج کل اس کی زندگی — خزاں کے تھپیڑے ہی تھپیڑے تھے۔

صبح اٹھتے ہی شبو نے فری کے ہاں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ وسیم دفتر جانے لگا تو اس نے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔ "میں آج فری کے ہاں جاؤں گی۔ دو دن وہیں رہوں گی —"

ماں کی تکلیف بڑھ رہی تھی۔ ایسے موقع پر شبو کا گھر سے دو دن کے لیے جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ وسیم صرف اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر جذبات کی گھٹن کے سائے تھے۔

شبو ماحول سے فرار پا کر اپنے افکارِ پریشاں کو آسودہ کرنا چاہتی تھی۔ ملازمہ کو ساس کے متعلق الٹی سیدھی ہدایتیں دینے کے بعد اس نے لبنیٰ کو تیار کیا۔ اپنے اور اس کے دو تین جوڑے بیگ میں رکھے۔ رکشا منگوایا۔ اور فری کے ہاں چل دی۔

فری کے ہاں پہاڑ پر برف باری دیکھنے کا پروگرام بن رہا تھا۔ اسحاق کے ساتھ وہ ایک ہفتہ کے لیے پہاڑ پر جا رہی تھی تنویر بیٹی نے

سنا تو وہ بھی تیار ہو گیا۔ فواد اور شہلا نے بھی اس پروگرام میں شمولیت کی خواہش کی۔

اور

پھر پروگرام کو اور وسعت دی گئی۔ قریبی دوستوں کو بلاوہ بھیجا گیا۔ غمِ ماضی اور فکرِ فردا سے آزاد لوگوں کے لیے اس سے اچھی تفریح بھلا اور کونسی ہو سکتی تھی۔ پہاڑ کی برفیلی شاموں اور ٹھٹھرتی صبحوں کا حسن دیکھنے سے ہی تو تعلق رکھتا تھا۔ اس پر بے تکلف دوستوں کا ساتھ۔ سبھی فرحاں و شاداں پہاڑ پر جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

شبو نے بڑی حسرت سے سُنا۔ کتنا جی چاہا۔ کہ وہ بھی بے فکروں کی اس محفل میں شامل ہو جائے۔

"تم بھی چلو نا شبو — وسیم مانیں گے تو نہیں۔ کسی طرح منا لو نا انھیں —"

فری شبو کے موجودہ حالات سے بے خبر تھی۔

شبو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بہن کا دکھ محسوس کر کے فری تڑپ اٹھی۔

"میں وسیم سے کہوں گی — کسی نہ کسی طرح تمھیں ساتھ جانے کی اجازت دلوا دوں گی۔" شبو نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔

تیسرے دن شبو واپس لوٹی۔ تو اسے فری چھوڑنے آئی۔ کافی دیر اس کی ساس کے پاس بیٹھی احوال پرسی کرتی رہی۔ وسیم جب دفتر سے آیا تو فری ماں کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

وہ سُبجھا سُبجھا سا فری سے احوال پُرسی کرتا رہا۔ فری دانستہ گفتگو کو خوش گوار بنا رہی تھی۔

دوپہر اس نے کھانا بھی وہیں کھایا۔

کھانے کے بعد باتوں ہی باتوں میں برف باری کا ذکر آ گیا۔

"سردی کی لہر اسی برف باری کی وجہ سے آئی ہوئی ہے۔" وسیم نے سگریٹ سلگایا۔

"پہاڑ پر تو بہت ہی ٹھنڈ ہو گی؟"

"ظاہر ہی ہے۔"

"ہم برف باری دیکھنے جا رہے ہیں۔"

"اچھا!"

"سنا ہے بڑا حسین موسم ہوتا ہے۔"

"ضرور ہوتا ہو گا۔"

اس نے سگریٹ کا طویل کش لیا۔ وہ اس قصے کو طول نہ دینا چاہتا تھا۔ لاشعور میں اک جانا پہچانا سا خوف جاگ اٹھا تھا۔ اس نے غور سے شبّو کی طرف دیکھا۔ چہرے پر لاتعداد مایوسیوں کا رنگ لیے وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔

"آپ بھی چلئے نا ہمارے ساتھ۔" فری نے وسیم کو مخاطب کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ہم غریب آدمی ہیں فری۔ یہ لوازمات آپ تم لوگوں کے لیے ہیں۔"

اس نے ٹھوس سنجیدگی سے کہا۔

"توبہ ہے بھائی جان۔" فری ساختہ ہنسی ہنس دی۔ "آپ تو بات کو خواہ مخواہ اور رنگ دے لیتے ہیں۔ چلیئے سارا خرچ میرے ذمہ — اب تو آپ کو اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔"

وسیم کو یوں لگا جیسے فری نے ڈھیر سی خیرات اس کی جھولی میں ڈال دی ہو۔ اس کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔ شبّو نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ وسیم کے بدلے تیوروں سے آج اسے ڈر نہیں لگا بلکہ غصہ آ گیا۔ وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

"فری!" وہ جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ "میں نے ابھی خیرات لینا شروع نہیں کی۔"

فری شرمندہ سی ہو گئی۔ شبّو کا منہ غصے سے لال ہو گیا۔

بدمزگی پیدا ہو چکی تھی۔ وسیم اُٹھ کر چلا گیا۔

"بڑے غیرت مند ہیں۔" فری نے اس کے جانے کے بعد پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"غیرت ہی غیرت ہے اور کیا ہے ان کے پاس۔" شبّو نے دل کے پھپھولے پھوڑے اور پھر شبّو اپنے نصیبوں کو کوستے ہوئے وسیم کو بھی بُرا بھلا کہنے لگی۔ فری کے دل میں وسیم کے لیے جو احترام تھا دم توڑ گیا۔ اس کی بہن اتنی دکھی ہو۔ اور وہ بہنوئی کو قابلِ احترام سمجھے؟ — یہ بھی کہیں کا دستور تھا بھلا —!

فری کے دعوت نامہ کی قبولیت سے انکار جھگڑے کی بنا بن گیا۔

شبّو گھٹ کر رہ گئی۔ وسیم سے اس کا دل متنفر ہو گیا۔ گھر بار — بچی سبھی سے دل بیزار ہو گیا۔ یہ بھی کوئی زندگی تھی۔ صبح سے شام تک خدمت گاروں کی طرح فرض انجام دیے جاؤ۔ خواہشوں اور آرزوؤں کا پورا ہونا تو ایک طرف ان کا دل میں گزر بھی گوارا نہ ہو — ٹوٹے ہوئے کل پرزوں والی گاڑی کی طرح زندگی تھی۔ جیسے بس مشقت سے دھکیلتے جاؤ۔

اب سکون و طمانیت کا سایہ تک نہ پڑ رہا تھا اس گھر پر — شبّو کی بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔ سوچ جھنجھلاہٹ بنتی جا رہی تھی۔ وسیم سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارا نہ تھا۔ بچی کو بلا وجہ مارنا معمول بن گیا تھا۔

وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھتی رہتی۔ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ چوبیس سال کی بھی نہ ہوئی تھی۔ لیکن دل بجھ گیا تھا۔ ولولے سرد پڑ گئے تھے۔ وہ فری سے یقیناً زیادہ خوبصورت تھی۔ لیکن فری کتنی

شگفتہ نظر آتی تھی۔ فرق یہی تھا نا کہ فری کی نگہداشت چابک دست ہاتھوں میں تھی۔

اور

وہ

بے آب و گیاہ کیاری کا وہ پھول تھی۔ جسے سرد و گرم ہواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

دن گزرتے گئے۔ وسیم شب و روز کے چکر میں اپنے مصائب کا حل ڈھونڈنے کی ناکام سعی کرتا رہا۔ اس کے بس میں کہاں تھا۔ اندھیروں کا باسی روپہلی روشنیوں کی جھلک کہاں سے لاتا — اونچی اڑان کے لیے بال و پر ہی نہ تھے۔

فری نے غصے کے اظہار کے طور پر شبّو کے ہاں آنا چھوڑ دیا۔
شبّو کا غصہ اور جھنجھلاہٹ اور بڑھ گئی۔

وہ جان بوجھ کر وسیم سے تغافل برتنے لگی۔ وقت پر ناشتہ تو اب کبھی نیا رہی نہ ہوتا۔ وسیم کئی مرتبہ دفتر بھوکا پیاسا گیا۔ وسیم بھی آخر مرد تھا کہاں تک برداشت کرتا۔ ایک دن شبّو سے الجھ بیٹھا۔

شبّو ہمیشہ کی طرح آج سر جھکا کر ڈبڈباتی آنکھوں سے اس کی گھڑکیاں سنتی رہی۔

آنکھیں جل تھل ہونے کی بجائے سرخ انگارہ ہو گئیں۔ تڑاخ سے جواب دیا — "کوئی ایک جنجال تو نہیں ہوتا نپٹنے کو۔ انسان ہوں مشین نہیں۔"

"یہ جنجال نئے تو نہیں، چار سال سے نبٹتی آ رہی ہو ــــ آج احساس ہوا انسان ہونے کا؟" وسیم غصے سے بولا۔

"صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔" وہ اس کے غصے سے سہمی نہیں۔

"کون سے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں؟" وہ گرجا۔

"ابھی پہاڑ ٹوٹنا باقی ہیں ــــ" وہ اسی آواز میں بولی ــــ "کام ذرا وقت پر نہ ہو۔ تو جناب کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنا تو سیکھا ہی نہیں ــــ بے دام کنیز ہوں نا؟ ــــ میرا دل تو ہے ہی نہیں۔ جیسے کوئی خواہش کروں وہ جرم ــــ کوئی بات کہوں وہ بری۔"

غصے میں لال پیلی وہ بولے گئی۔

وہ ششدر سا اسے دیکھتا رہا۔

یہ وہی شبو تھی جو اس کی زندگی میں بہار کی نئی رت کی طرح داخل ہوئی تھی ــــ

جس نے اس کی روکھی پھیکی زندگی کو دلفریب رنگ بخشا تھا۔

جو اس کی ذرا سی تکلیف پہ مچل جایا کرتی تھی۔

جو اس کے چہرے پہ غصے کے آثار دیکھتے ہی سر جھکا لیا کرتی تھی۔

اور

جس کی آنکھیں اس کی معمولی سی سرزنش پہ ہی جل تھل ہو جایا کرتی تھیں۔

بڑے دکھ سے وہ سوچ میں ڈوبا رہا۔ شبو بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ خانگی زندگی اپنا رخ جس طرف موڑ رہی تھی۔ وہ خطرناک تھا۔

وسیم کو شبو سے گلہ تھا۔ شکایت تھی۔ یہ گلہ اور شکایت غصے کی صورت میں ڈھل رہے تھے۔

کشیدگی، جس نے بڑی آہستگی اور غیر محسوس طریق سے جنم لیا تھا۔ اب میدان ہموار پا کر سرعت سے بڑھنے لگی۔

ایک دوسرے کے متعلق ہمدردی سے سوچنا دونوں ہی نے چھوڑ دیا تھا۔ وسیم شبو کو موردِ الزام ٹھہراتا۔ اور شبو وسیم کو ــــ گرم خون میں ابال آیا ہوا تھا۔ مستقبل کیا پیش کرنے والا تھا۔ دونوں اس بات سے اپنے آپ کو بے خبر کیے رہے۔

شبو اب ہٹ دھرمی اور خود سری پر اتر آئی تھی۔ بات بات پر تڑاخ تڑاخ جواب دینا اس کا معمول بن چکا تھا۔ ہر بات میں من مانی کرنے لگی۔ فری کے ہاں جانا آنا اسی طرح رہا ــــ اب وہ کچھ اور آگے بڑھی۔ فری کے ملنے جلنے والوں کے ہاں بھی بے تکلفی سے جانے لگی۔ فرید اب بھی اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا۔ وہ مسکرا مسکرا کر اس کی باتوں کی داد دیتی ــــ آزاد خیال ہو گئی تھی نا!

وسیم سے جیسے اسے کوئی لگاؤ ہی نہ رہا تھا۔ فری بھی وسیم کے خلاف زہر اگلتی۔ جس سے شبو کے متنفرانہ جذبات کو اور ہوا ملتی ــــ وسیم کو برا بھلا کہتے ہوئے شبو قطعاً بھول جاتی، کہ اس میں کتنی خوبیاں تھیں، کتنی محبت ــــ کتنی عقیدت اور کتنا خلوص اس نے اس پہ نچھاور کیا تھا۔ اس کو خوش رکھنے کے لیے اس نے کتنی ذہنی اور جسمانی اذیتیں جھیلی تھیں۔ محدود آمدنی میں اضافہ

کے لیے انتھک کام کیا تھا محض اس لیے کہ شبّو کے ہونٹوں کا لٹا ہوا تبسم واپس لوٹ آئے۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کا رنگ زردی مائل ہوتا گیا تھا۔ اس کا مضبوط جسم گھلنے لگا تھا لیکن وہ پھر بھی شبّو کی خاطر کام کیے جا رہا تھا۔

شبّو بھول چکی تھی۔

سب کچھ بھول چکی تھی۔

اور۔

اب تو وسیم نے بھی چُپ اختیار کر لی تھی۔ چند بار جھڑپ لینے کے بعد وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ ماں کی بیماری اور گھر کی پریشانی نے اُس کی صحت پر بھی برا اثر ڈالا تھا۔ سر درد کی شکایت تو مستقلاً تھی۔ ہر وقت نڈھال سا رہتا۔ زندگی گلاب کی اس ننگی ٹہنی کی طرح تھی۔ جس سے پھول پتیاں جھڑ جانے کے بعد صرف کانٹے ہی کانٹے رہ گئے ہوں۔

دل کا درد روگ بنتا گیا۔

شبّو نے ذرہ بھر پروا نہ کی۔ کبھی دل کی خلش بے چین کرتی بھی تو بہلاوے کے اس نے کئی طریقے سیکھ لیے تھے۔ فری کے ہاں چلی جاتی۔ جہاں کوئی نہ کوئی ایسا پروگرام بن جاتا۔ جو ذہن سے ہر بوجھ دُور اتار پھینکتا۔

اس دن وسیم دفتر سے لوٹا تو بڑا نڈھال ہو رہا تھا۔

سر میں شدت کا درد تھا۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ گھر میں داخل ہوا۔ آج آسودگی کی خواہش نے بھی اسے بے چین کر رکھا تھا۔ ذہنی تفاوتیں بڑھ

جانے کے باوجود آج وہ شبّو سے التفات چاہتا تھا۔ وہ شبّو کو منا لینے کے لیے اپنے کو آمادہ کر رہا تھا۔ اس کی ہر خطا معاف، اس کی ہر کوتاہی درگزر کر دینے کا جذبہ دل میں مچل رہا تھا۔ شبّو نہ سہی وہی پہل کرے گا۔ طوفانوں میں ہچکولے کھاتی کشتی کو کنارے پہ لانے کے لیے مضبوط ہاتھوں ہی کی ضرورت تھی نا —!

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا — شبّو باہر جانے کو تیار ہو رہی تھی۔ اس نے فری کا اُترا ہوا جوڑا پہن رکھا تھا۔ وسیم کو کتنا دکھ ہوتا تھا۔ جب اُترے ہوئے کپڑے فری کے پہنتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ازلی ننگی ہے اور یہ اُترنیں اس کی برہنگی کو ڈھانپ لینے کی بجائے اور اُجاگر کر رہی ہیں۔

وہ کئی دفعہ اسے منع کر چکا تھا۔

لیکن

شبّو

اسے ان باتوں پہ کان دھرنے کی کیا ضرورت تھی!

وسیم نے اک نظر اس کی طرف دیکھا۔ دل کے جذبے دل ہی میں رہ گئے —

"میں فری کے ہاں جا رہی ہوں۔" اپنے چہرے کا آئینے میں جائزہ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

وسیم نے کوٹ اُتار کر کرسی پر پھینک دیا۔ اور خود نڈھال سا پلنگ پر پڑ گیا۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، آنکھیں بند کیے وہ کتنی ہی دیر پڑا رہا — شبّو

اپنے لباس اور بناؤ سنگار ہی میں محو رہی۔

ایک نظر اس نے وسیم کو دیکھا۔ لمحہ بھر کو اس کا دل ڈول گیا۔ کتنا کمزور نظر آ رہا تھا وہ۔ ٹانگوں کو بے چینی سے ہلا رہا تھا۔ شبو کے دل میں ہُوک سی اٹھی۔ اس نے چاہا کہ جا کر وسیم کا حال پوچھے لیکن اس اُبھرنے والے جذبے کو اس نے جلد ہی دبا لیا۔ آج تو وہ فرید کے ہاں جا رہی تھی جہاں موسیقی کا جاندار پروگرام تھا۔ وسیم کے بارے میں سوچنے بیٹھ جاتی۔ تو اس محفل میں شرکت کیسے کرتی۔

وہ پھر آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ سُرخی کی اک اور تہہ ہونٹوں پر جمانے کے بعد وہ اٹھی۔ بٹوا اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

قدموں کی چاپ سے اس کے چلے جانے کا اندازہ ہو گیا تو وسیم نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

وہ جا چکی تھی۔ وسیم کو یوں لگا جیسے شبو کمرے سے نہیں اس کی زندگی سے نکل گئی ہو۔ مصالحت کا جذبہ جو آج دن بھر اسے بے چین کیے رہا بے موت ہی مر گیا۔

کروٹ بدل کر اس نے تکیہ میں منہ چھپا لیا۔ سر درد اور بڑھ گیا۔ مستقبل کی تاریکیاں اسے نگل جانے کو منہ پھاڑے بڑھ رہی تھیں — بے چین ہو کر اس نے پہلو بدلا۔ لیکن درد جس پہلو پہ بدلو درد رہے — وسیم کو قرار کیونکر آتا۔ جانے کب تک وہ بسمل سا بستر پہ پڑا رہا۔ ملازمہ چائے کی پیالی لے کر آ گئی۔

"چائے" اس نے کہا۔

"چائے"

"میز پر رکھ دو" وسیم نے آنکھیں بند کئے ہوئے کہا۔

"چائے پی کر — ذرا العینٰی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ بیٹا" ملازمہ نے کہا۔

"کیوں" وہ ایک دم اٹھ بیٹھا — "اسے کیا ہوا!"

"صبح سے بخار ہے۔"

میں کب سے دفتر سے آیا ہوں۔ پہلے کیوں نہ بتایا"

"سو رہی تھی۔ اب اٹھی ہے۔ بُخار زیادہ ہی تیز معلوم ہوتا ہے"

"کہاں ہے وہ —"

"بڑی بی بی کے پاس"

"وہاں کیوں رکھا اسے اماں خود بیمار ہیں —"

"میں باورچی خانے میں تھی بیٹا — اسے کہاں سُلاتی۔ بی بی تو بہن کے گھر چلی گئیں۔ کہا بھی تھا۔ بچّی کو بخار ہے —"

وسیم نے سر جُھکا لیا۔

چائے پیئے بغیر وہ اٹھ کر ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ ماں کے نحیف بازوؤں میں بچّی سو رہی تھی۔ امّی کا لفظ ہونٹوں پر تھرک رہا تھا۔

وسیم نے جلدی سے بچّی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا — "آپ لیٹ جائیں امّاں۔ طبیعت بگڑ جائے گی —"

بچّی کی پیشانی پر ہونٹ رکھتے ہوئے وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔

"اسے کیا ہوا — کب بخار ہوا — صبح تو اچھی بھلی میرے ساتھ چائے پی رہی تھی —"

"ابو!" بچّی باپ کی چھاتی سے لگ کر بے اختیار رو دی۔

وسیم نے اسے چھاتی سے چمٹا لیا۔

اسے اپنے کمرے میں لا کر پلنگ پر لٹا دیا — اس کے لیے دوائی لایا۔

شام ہو گئی۔ بخار کی حدّت کم نہ ہوئی۔ وہ بچّی کو ماں کے کمرے میں لے آیا — دونوں کی دیکھ بھال جو کرنا تھی۔

بچّی ماں کے لیے کئی بار روئی۔

وسیم کا دل غم و غصہ سے جل اٹھا۔ اس نے شبو کو جو جی میں آیا کہہ دیا۔ جہاندیدہ ماں گھر پر امڈنے والی مصائب کی بدلیوں سے بے خبر نہ تھی۔ وسیم کی باتوں نے ثبوت بہم پہنچایا لیکن وہ کسی طور سختی کی قائل نہ تھی۔

"بہو کو آرام سے سمجھاؤ وسیم — اکڑی شاخ ذرا سے دبانے سے ٹوٹ جاتی ہے —"

"بلا سے ٹوٹ جائے — ایسی حالت سے تو اس کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے ماں۔"

"دنیا کو تماشہ دکھاؤ گے۔"

"تو میں کیا کروں ماں۔"

"زندگی میں نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں بیٹا — گھبرا کر ہتھیار ڈال دینا مردوں کا کام نہیں — حالات سے مصالحت اچھی ہے۔ تم ہی جھک جایا کرو۔"

وسیم خاموش رہا۔ ماں کو کیسے بتاتا۔ کہ حالات کی آندھی کتنی شدت اختیار کر چکی ہے۔ معاملہ کہاں پہنچ چکا ہے —"

معاملہ کہاں پہنچ چکا تھا۔

اس سے

شاید

وسیم خود بھی بے خبر تھا۔

بچّی ماں کے لیے تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔

"وسیم جاؤ اسے بلا لاؤ — اب تو رات ہو رہی ہے وہ جانے کب لوٹے۔"

وسیم جانے پر رضامند نہ تھا۔

"آ جائے گی خود ہی —"

"بچی کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا ہے — اسی کی خاطر چلے جاؤ —"

ماں نے بار بار زور دیا۔

"میری طبیعت خراب نہ ہوتی تو میں اسے سنبھال لیتی — جاؤ شبو کو لے آؤ۔"

وسیم کو مجبوراً فری کے ہاں جانا پڑا۔

سینے میں غصے کی چنگاریاں سوچ کی ہوا سے شعلہ بنی جا رہی تھیں۔

وہ فری کے ہاں پہنچا۔

پورچ میں دو تین نوکر بے فکری سے سگریٹ کے دھوئیں اڑا رہے تھے۔

"گھر پر تو کوئی نہیں ہے صاحب۔" وسیم کو دیکھ کر ایک نوکر بولا۔

"کہاں ہیں؟" وسیم نے تلخی نگلتے ہوئے پوچھا۔

"فرید صاحب کے ہاں دعوت ہے آج — گانے بجانے کا بھی پروگرام ہے —"

وسیم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"شبّو بھی گئی ہیں؟"

جی ہاں — سبھی گئے ہیں۔"

"کب تک آئیں گے؟"

"کیا خبر صاحب۔ کس وقت آئیں۔ کیا عجب آج رات وہیں رہ جائیں۔ شہر کی مشہور گانے والی کو بلا رکھا ہے آج تو۔"

شبّو — فرید — محفلِ موسیقی — وسیم کا دماغ بھٹی کی طرح جل اٹھا — فرید سے میل جول پہ اس نے کتنی کڑی پابندی لگائی تھی۔ اسی کی ذات تو سارے جھگڑے کا سبب تھی — اور — اب شبّو پھر اس کے ہاں گئی تھی۔

وسیم کی آنکھوں سے ایک دم کئی پردے اٹھ گئے — اس کا خون کھول اٹھا — غصے سے کانپتے وجود کو لیے جانے وہ کیسے گھر پہنچا۔

بچی رو رو کر سو چکی تھی۔

وسیم نے مجنونانہ انداز سے بچی کو ماں کے بازوؤں سے اچک لیا۔

ماں شبّو کے بارے میں پوچھتی رہی — لیکن وہ "آ جائے گی خود ہی" کہہ کر بچی کو اپنے کمرے میں لے گیا۔

باپ کے سینے کا شفیق لمس بچّی کے سکون کا باعث بنا — آہستگی
سے اس نے لبنیٰ کو پلنگ پر ڈال کر کمبل اوڑھا دیا۔

بچّی سکون پذیر تھی۔

لیکن

وسیم

اس کا سینہ جذبات کی کش مکش سے جلتی ہوئی بھٹی بنا تھا آج اس
کے صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ آج رواداری نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ آج ضبط کی
حدیں ٹوٹ گئی تھیں۔

محبت مجروح ہو تو سسک سسک کر دم توڑ سکتی ہے لیکن
جب غیرت پر چوٹ پڑے تو قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

وسیم دیوانہ وار کبھی صحن میں، کبھی کمرے میں پھر رہا تھا مشتعل
جذبات سرد ہونے کی بجائے اور بھڑک رہے تھے۔

ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ دروازے پر موٹر رکنے کی آواز آئی۔
وسیم کی آنکھوں میں شعلے لپک گئے۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر درمیان میں کھڑا ہو گیا۔
شبّو نے اسے نظر انداز کر کے چپکے سے اندر داخل ہونا چاہا۔

"کہاں سے آئی ہو؟" وسیم گرجا — شبّو نے سہم کر دیکھا۔ ڈرائیور
بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"فری کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ دیر ہو گئی" اس نے ہولے سے کہا۔

"بکواس بند کرو — فریدہ کے ہاں رنگ رلیاں منانے کے بعد
فرصت مل گئی۔ دفع ہو جاؤ جہاں سے آئی ہو —" وسیم نے اسے دھکا دیا۔
"تمہارا نحس وجود اب اس گھر میں آیا۔ تو ٹکڑے اڑا دوں گا"

"وسیم" وہ گرتے گرتے بمشکل بچی" ایک بار اس نے پھر اندر داخل
ہونے کی کوشش کی۔

"ذلیل عورت — دور ہو جاؤ میری نظروں سے" غصے سے وسیم
نے دروازہ بند کر دیا۔

"صاحب غصے میں ہیں" ڈرائیور گاڑی سے نکل آیا — "بہتر ہے
اس وقت آپ واپس ہی چلی چلیں — محلے بھر کو سنانے کی کیا ضرورت ہے"
شبّو گنگ سی کھڑی تھی۔ وہ پہلے بھی تو کئی بار دیر سے آئی تھی لیکن
وسیم اس طرح تو کبھی پیش نہ آیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا۔ کہ ناراض ہو

جاتا- کئی کئی دن کلام نہ کرتا۔

لیکن

آج

آج تو وہ مجسّم شعلہ بنا ہوا تھا- فریدہ کے ہاں جانے کا اسے کیسے پتہ چل گیا- شبّو کا سارا وجود تھر تھر کانپنے لگا۔

ڈرائیور کے کہنے پر وہ گاڑی میں آ بیٹھی- ڈرائیور کے سامنے اتنی بےعزتی ہوئی تھی- اسے بھی غصہ آ گیا- دانت کچکچاتے ہوئے اس نے دروازے پر نظر ڈالی۔

فری اور اسحاق خواب گاہ میں جا چکے تھے- شبّو پچھلی طرف سے کوٹھی میں آئی- ڈرائنگ رُوم کے ساتھ والے کمرے میں ایک پلنگ بچھا تھا- وہ اسی کمرے میں آ گئی۔

وہ غصے سے زخمی ناگن کی طرح تلملا رہی تھی- ڈرائیور کے سامنے وسیم نے اس کی عزت خاک میں ملا دی تھی- اس کا ساختہ وقار بری طرح مجروح ہوا تھا۔

کافی دیر پیچ و تاب کھاتے ہوتے اپنی تحقیر کا انتقام لینے کے متعلق وہ سوچتی رہی- اُس نے وسیم سے ناطہ توڑ لینے کا بھی سنجیدگی سے سوچا۔

لیکن

اس کا ناطہ صرف وسیم ہی سے نہ تھا- بچی بھی تو ڈوری تھی- جس نے دونوں کو باندھ رکھا تھا۔

بچی کا خیال آتے ہی اس کا غصہ دُودھ کے اُبال کی طرح بیٹھنے لگا۔ وُہ نڈھال ہو کر بستر پر گر گئی- اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے لگی۔

اس کا ضمیر جاگ اٹھا- وہ اپنی نظروں میں آپ ہی مجرم ہو گئی- ہر جگہ اپنی زیادتی ہی کار فرما نظر آ رہی تھی۔

گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھی —— وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی- جیسے اسے پہلی بار احساس ہوا- سراب کو پکڑنے کے لیے حقیقت کا دامن چھوڑ چکی تھی- بیوی کا تقدس اور مامتا کا حق مار بیٹھی تھی۔

وہ جُوں جُوں سوچتی گئی- ڈوبتی گئی- آخر اس نے اعتراف کر لیا- کہ وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئی ہے۔

رات یونہی گزرتی چلی گئی- اس کے اندر کی عورت جاگ اٹھی —— وُہ عورت جس کے سینے میں خلوص اور پیار سے معمور دل تھا۔

وقت گزرتا گیا- رات کی پلکیں بھیگ گئیں- سناٹا سا طاری رہا۔ شبّو کے جذبات اک موڑ پر آ کر تھم گئے- صبح ہی صبح اس نے گھر جا کر وسیم کے قدموں سے لپٹ کر معافی مانگنے کا تہیہ کر لیا۔

وسیم

اس کا اپنا وسیم

اس کا پہلا پیار

اس کی پہلی محبت

وہ اس کی ٹھوکروں ہی میں زندگی کا مزہ پائے گی۔

اس فیصلے سے اس نے سکون و طمانیت کا احساس کیا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ رات کا پچھلا پہر دم توڑ رہا تھا۔ تھکے ہوئے دماغ سے بوجھ اٹھ گیا۔ شبو جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

شبو کے بیدار ہونے سے پہلے ہی ڈرائیور نے ساری روئیداد فری کے گوش گزار کر دی۔ ہمدردی جتانے کو اس نے قصہ بڑھا چڑھا کر سنایا۔ فری سنتے ہی سیخ پا ہو گئی۔ اسحاق کو بھی غصہ آ گیا۔ اس کے ڈرائیور کے سامنے یہ واردات ہوئی تھی۔ ان کی سبکی ہی تھی نا ——

"انسان نہیں جانور ہے جانور —— بیوی پر تو اعتماد ہی نہیں۔ بڑا آیا غیرت مند —— پلّے دھیلا نہیں اور دھونس اتنی —— فری غصے سے سُرخ ہو ہو گئی —— اور پھر جو منہ میں آیا وسیم کو کہہ ڈالا۔ اسحاق بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتے گیا۔

شبو عزم صمیم لیے بیدار ہوئی۔ اس کے بستر سے اٹھنے سے پہلے ہی فری آندھی کے جھونکے کی طرح اندر آئی۔ ریشمی گاؤن کی ڈوریوں کو بار بار گرہ لگاتے ہوئے وہ برس پڑی :

"کیا ہوا تھا رات —— اسی وقت مجھے کیوں نہ بتایا —— میرے ڈرائیور کے سامنے اس نے تمھاری بے عزتی کی ہے —— کیا سمجھ رکھا ہے اس نے۔ تم کوئی گری پڑی تو نہیں ہو ——"

شبو نے متانت سے اسے دیکھا۔ اور پھر سر جھکا کر بولی "کوئی بات نہیں۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ قصور اُن کا نہیں میرا ہے۔ غصہ تو

انھیں حق پر آیا ہے۔"

"شبو تمھاری سادگی ہی تمھیں لے ڈوبی —— فری پلنگ پہ بیٹھتے ہوئے غصے سے بولی "تمھاری جی حضوری نے تو اسے اتنا جرأت مند بنا دیا ہے —— روز روز کا جھگڑا —— اس کا تو اب فیصلہ ہو کر ہی رہے گا۔ گولی سے اڑا دینے کو جی چاہتا ہے۔"

"فری!" شبو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"پھوٹ پڑی محبت؟" فری نے طنز کیا "جوتیاں کھاتی رہو اور اسی کے قدموں سے لپٹی رہو —— تمھاری تو غیرت بھی مر چکی ہے —— لعنت ہے ایسی زندگی پر جس میں عزت نہ ہو۔"

فری وسیم کے خلاف آگ اگلتی رہی۔

اور

آخر

اس آگ نے اس عزم کا دامن پکڑ ہی لیا۔ جو شبو نے پچھلے پہر کے سلگتے لمحوں میں کیا تھا۔

"میں تو اب تمھیں بالکل وہاں نہ جانے دوں گی۔ روز روز کی بک بک سے مجھے اسحاق سے کتنی شرم اور ندامت محسوس ہوتی ہے۔ کیا کہتے ہوں گے کہ کیسے لوگوں سے پالا پڑا" فری نے تقریر کر ڈالی۔ دولت مند بہن برافروختہ تھی۔ شبو جیسی متلون مزاج عورت کو اس کا پاس کیونکر نہ ہوتا۔ وہ ہنستی رہی اس کا عزم ڈگمگاتا رہا۔ اور آخر اس نے وسیم کے پاس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح بچی کا بخار اتر گیا۔

لیکن

وسیم کے دل کا غبار نہیں دھلا۔

شبو دوبارہ دروازہ کھٹکھٹاتی ــ منت سماجت کرتی۔ رو رو کر رات چوکھٹ پر گزار دیتی تو شاید اس کے سینے میں اٹھتے ہوئے طوفان تھم جاتے لیکن ہوا کیا تھا؟

دروازہ بند کر کے ابھی وہ اپنے کمرے میں بھی نہ پہنچا تھا کہ موٹر اس کی لاشعوری خواہش کو روندتی ہوئی واپس چلی گئی۔

وہ رات بھر غم اور غصے کی آگ میں جلتا رہا۔ رات بھر اس کے کان دروازے کی آہٹ پر لگے رہے۔ شاید کسی وقت شبو پچھتاوہ محسوس کر کے لوٹ آتے۔ لیکن بے رحم رات ٹھنک ٹھنک کر چلتی رہی۔

وہ نہ آئی۔

اور

دن تھکی تھکی انگڑائیاں لے کر بیدار ہو گیا۔

وسیم کی حالت دید کے قابل تھی۔ بال پریشان، آنکھیں سرخ اور جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی دکھی دل سے نکلی ہوئی آہ منجمد ہو گئی ہو۔

ماں کے کھانسنے کی آواز پر وہ اس کے کمرے میں گیا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ماں کی حالت رات بھر ہی میں غیر ہو گئی تھی۔ کسی فوری صدمے کا اثر تھا۔ شاید اس نے رات شبو اور وسیم کی تکرار سن لی تھی۔ صدموں سے چور دل اب مزید صدموں کا بوجھ سہارنے کے قابل کہاں رہا تھا۔

وسیم جلدی سے ڈاکٹر کو لے آیا۔

مرض پرانا تھا۔ اور فوری صدمے سے عود کر آیا تھا۔ دوائیاں تجویز ہوئیں۔ خوراک اور آرام کا خاص خیال رکھنے کی تلقین کر کے ڈاکٹر چل دیا۔

لیکن ماں کی حالت سنبھلی نہیں۔

ادھر بینی نے ماں کے لیے رونا شروع کر دیا۔ بوڑھی ملازمہ نے اسے بہلانے کے بڑے جتن کیے۔ لیکن وہ برابر روں روں کیے گئی۔

وسیم کی پریشانیوں میں ناقابل برداشت اضافہ ہو گیا۔ ماں کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ بینی الگ رو رو کر حال تباہ کر رہی تھی۔ وسیم اور ملازمہ مشکل کی ان گھڑیوں کو نباہ رہے تھے۔ بوڑھی ملازمہ بڑی تندہی سے خدمت کر رہی تھی۔ وسیم اس کی محنت دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ بیوی سے تو یہ پندرہ روپے

ماہوار کی ملازمہ ہی اچھی، جو کسی دینی یا دنیوی تعلق کے بغیر اپنی بوڑھی جان نچھاور کر رہی ہے۔

رات افراتفری میں گزری ——— وسیم اس رات بھی اک لمحہ کو نہ سو سکا۔

ماں ذرا سکون پذیر ہوتی تو لبنیٰ چیخ پڑتی ——— جھنجھلا کر وہ ایک بار اس نے لبنیٰ کے پھول سے رخساروں پر تھپڑ بھی مارا —— لیکن جب وہ بلک بلک کر رو دی۔ تو فرطِ غم سے اس کا اپنا کلیجہ ہی پھٹنے لگا۔ بچی کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور اسے گود میں لیے ماں کی چارپائی کے نزدیک کرسی پر بیٹھا رہا۔

صبح وہ پھر دفتر نہیں گیا۔ چند دنوں کی رخصت لے لی —— لیکن گھر کا سارا انتظام سنبھالنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ماں تو جیسے زندگی کا بوجھ اتار پھینکنے کا عزم کر بیٹھی تھی۔ ملازمہ خدمت کرتے تھک گئی۔ خود اس کا اپنا برا حال تھا۔

تیسرے دن ملازمہ نے وسیم کی منت کی۔ "غصہ تھوک دو بیٹے۔ جا کر شبو بی بی کو لے آؤ ——— تلخیاں تو سمیٹی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر بچی کو کچھ ہو گیا تو ——"

"اس کا نام نہ لو خالہ بی" وہ جھنجھلا گیا۔

"بڑی بی کی حالت بھی تو دیکھو ——— اللہ جانے کیا ——" وہ مشکوک انداز میں کہہ کر چپ ہو گئی۔

"بی بی گھر آ جائے۔ تو بڑی بی کی تیمارداری بھی اچھی طرح سے ہو سکے گی ——" اس نے پھر شبو کے بلانے پر زور دیا۔

وسیم ماں کی تیمارداری دل و جان سے کرنا چاہتا تھا۔ ماں —— کتنی مقدس ہستی تھی۔

جس نے اپنی امنگوں اور آرزوؤں کا خون دے کر اس کا نخلِ حیات سینچا تھا۔ جس نے نامساعد حالات کا بھی سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا تھا۔ جو بے سہارا ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے چٹانوں سے مضبوط سہارا بن گئی تھی۔

وسیم شبو کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا لیکن گھر کے حالات متقاضی تھے کہ وہ اپنے بپھرے ہوئے جذبات کو مصلحت کی سلوں تلے دفن کر دے۔

دوپہر پھر ملازمہ نے شبو کو بلا لانے کے لیے کہا۔

"میں نہیں جا سکتا وہاں خالہ جی ——"

"مجھے اجازت دو —— میں لے آؤں انھیں۔"

"چلی جاؤ ——"

ملازمہ وسیم کو بچی دے کر شبو کو لینے چل دی۔

نری اور اسحاق کہیں جا رہے تھے۔ ملازمہ انھیں گیٹ کے قریب مل گئی۔

اسحاق نے گاڑی روک لی۔ نری نے اشارہ سے ملازمہ کو بلایا۔

"کیوں؟"

ملازمہ نے سلام کیا۔

"کیسے آئی ہو —" فرزی نے تنک کر پوچھا۔

"شبو بی بی سے کام ہے۔" ملازمہ نے مؤدبانہ کہا۔

"کیا کام ہے؟"

"بڑی بی سخت بیمار ہیں۔ بچی بھی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ انھیں لینے کو صاحب نے بھیجا ہے۔"

"ہونہہ —" صاحب کو ماں اور بچی کے لیے خادمہ کا خیال آ گیا۔ بیوی کی اسے ضرورت تھوڑا ہی ہے۔"

"ہاں جی! اسے خود آ جانا چاہیئے تھا لینے کو۔" اسحاق نے لقمہ دیا۔

"توبہ کرو جی — خود بھی آ جاتا تو میں کہاں جانے دیتی۔ اب تو اس کے وہاں جانے کا سوال ہی نہیں۔"

"بی بی کہاں ہوں گی؟"

"تم واپس چلی جاؤ۔ اس تک کوئی پیغام پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے صاحب نے اسے کوئی گری پڑی عورت سمجھ رکھا ہے شاید۔"

"بیگم صاحب بچی ہی کے لیے —"

"بچی اس پر بار ہے تو اسے بھیج دے۔"

"بڑی بی بی کی حالت بہت خراب ہے بیگم صاحب۔ کل کو کچھ ہرج ہو گیا تو —" ملازمہ نے منت کی۔

"بی بی کے لیے نرس رکھ لے۔ شبو خدمت گار نہیں ہے۔"

"بیگم صاحب۔"

"زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں بڑی بی —" "تم جا کر وسیم سے کہہ دو شبو بیوی ہے۔ خدمت گار نہیں ہے۔ جب وہ بیوی کے حقوق ادا نہیں کر سکتا تو اس سے خدمت لینے کا اسے حق ہی کیا ہے۔"

ملازمہ نے بہتیری کوشش کی — فرزی نہ مانی — دھتکار کر اسے گیٹ سے باہر ہو جانے کا حکم دیا۔

بڑی بی بیچاری منہ لٹکائے گھر چلی گئی۔

فرزی کا پیغام وسیم کو دیا — ساری باتیں پوری وضاحت سے اس کے گوش گزار کیں۔

وسیم تلملا کر رہ گیا۔ بڑی بی کو بھی سنا ڈالیں۔ اس نے ہی تو شبو کو بلانے کی تحریک شروع کی تھی۔ فرزی کے تو نام سے متنفر ہو گیا۔ وہی تو تیز دھار کی چھری بن کر اس کی ازدواجی زندگی پہ پھر گئی تھی۔

رات بھر وہ بیوی کے حقوق کے متعلق سوچتا رہا۔ اس نے شبو کے کون سے حق غصب کئے تھے کن فرائض کی ادائیگی اس سے نہ ہوئی تھی۔ اس نے تن من دھن سبھی کچھ شبو پر نچھاور کر دیا تھا۔ سینے میں درد بنا کر بسایا تھا۔

کیا بیوی کے یہی حقوق تھے — کہ اسے بنا سنوار کر غیروں کی ہوسناک نظروں کا نشانہ بننے دے۔ کوٹھی بنوا دے — موٹر خرید دے — مستقبل کے سہانے خواب دکھاتا رہے — اگر یہی بیوی کے حقوق تھے تو

واقعی اس سے کوتاہی ہوئی تھی۔

وہ اک عام سا آدمی جس نے ضروریات سے نپٹنے ہی میں فخر سمجھا تھا۔ اتنی اونچی اڑان کے لیے وہ بال و پر کہاں سے لاتا؟

ماں کی حالت جب بھی سنبھلتی۔ وہ بیٹے سے شبو کے بارے میں پوچھتی — وسیم ٹال مٹول سے ماں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔

شام کے دھندلکے پھیل رہے تھے۔ وسیم ماں کی پٹی پر بیٹھا اس کا سر آہستہ آہستہ سہلا رہا تھا۔ آج ماں کی حالت قدرے بہتر تھی۔

"وسیم" ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نحیف آواز میں کہا۔

"جی" وہ اس پر جھک گیا۔

"شبو کو لے آؤ"

"ماں —"

"مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ بیٹے —" بڑی ہی کمزور آواز میں وہ بولی۔

"جو آگ تمہارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ وہ مجھ سے چھپی نہیں بیٹا حالات سے سمجھوتہ کر لو بیٹے — اجڑے گھر کبھی نہیں بنتے — تم ہی ہار مان جاؤ —"

"ماں ——" وسیم کی آواز فرطِ جذبات سے لرز گئی۔ چہرہ دونوں ہاتھوں پہ گرا کر اس نے اپنے ہیجانی جذبات کو چھپا لینے کی کوشش کی۔

"میرے بچے ——" ماں نے اس کی گود میں ہاتھ رکھ کر نحیف آواز میں کہا:۔

"جذباتی بن کر نہیں —— عقلمند بن کر نباہ کرنے کی کوشش کرو۔"

"میری تو عقل بھی اب جواب دے گئی ہے ماں ——" وسیم کی آواز بھرا گئی ——

"میں جانتا ہوں وہ اب یہاں نہیں آئے گی —— وہ کلبوں میں گھومنا چاہتی ہے —— وہ محلوں میں رہنا چاہتی ہے —— یہاں اُس کے لیے کیا رکھا ہے ماں —— ملازمہ تو نہیں وُہ ——"

"ملازمہ نہیں مالکہ ہے وُہ —— اپنی بچی ہی کی خاطر ——" ماں کی آواز ڈوب گئی۔

"ہونہہ" وسیم نے جھکا ہوا سر اٹھا کر کہا —— "بچی ؟ ممتا کا لاشہ سونے چاندی کی سلوں تلے دب چکا ہے ماں۔"

"وسیم" ماں لرز گئی۔

"وہ نہیں آئے گی —— میں جانتا ہوں۔ کبھی نہیں آئے گی —— بس —— اب" اس کی آواز گھٹ گئی۔

"تمہارا گھر —— برباد ——" ماں تڑپ کر رہ گئی۔

"جس کی تقدیر پر ازل ہی سے بربادی کی مُہر لگی ہو —— وُہ آباد بھی

کیسے ہو سکتا ہے ماں ——"

بے قرار ہو کر اس نے اپنا سر ماں کی چھاتی پر رکھ دیا۔

اس کا دکھی دل مچل گیا تھا۔

لیکن اپنی غلطی کا اسے جلد ہی احساس ہو گیا۔ ماں کا سانس اُلجھ گیا، وسیم نے جلدی سے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

"ماں !" وہ چیخا ——

ملازمہ دوڑی آئی —— جلدی جلدی چھاتی سہلانے لگی —— گردن اونچی کی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد ماں کی حالت کچھ سنبھلی۔

وسیم کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ اپنے دُکھ تو سینے کے داغ بننے کے لیے ہوتے ہیں —— جانے آج وہ ماں کے سامنے انہیں کیوں عُریاں کر بیٹھا ——

وقتی طور پر افاقہ ہوا —— لیکن روگ گہری جڑیں پکڑ چکا تھا۔ حالت دن بدن بگڑتی رہی۔

شبو نہیں آئی۔ مجبور ہو کر اس نے لبنیٰ کو بھی وہیں بھیج دیا۔ اسے سنبھالنا مشکل تھا۔ ماں کی تکلیف ہی ایسی تھی نا ——

ہفتہ بھر کشمکش موت و حیات میں رہ کر ماں نے ہار مان لی۔ اس کا حیات سے ناطہ ٹوٹ گیا۔

وسیم بچہ نہیں۔ جوان مرد تھا —— لیکن ماں کی موت کا اثر اس نے بچوں سے بھی بڑھ کر لیا۔ ماں پہلا اور آخری سہارا تھی۔ وہ بھی نہ رہا۔

وسیم کے دل کے سارے زخم رسنے لگے تھے۔ ہزار کوشش ضبط
وہ اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا۔ اس پر مجنونانہ سی کیفیت طاری ہو گئی۔
دوستوں اور دُور پار کے رشتہ داروں نے مل کر ماں کو آخری منزل
پر پہنچانے کا انتظام کیا۔

ساس کے مرنے کی خبر شبّو تک بھی پہنچی۔ یوں بھی آجکل ذہنی خلفشار
سے دوچار تھی۔ اس خبر کا بہت اثر لیا۔ وہ اسی وقت جانے کے لیے
تیار ہو گئی۔

"میں تو جانے کے حق میں نہیں۔" فری نے اسے ٹوکا۔

"نہیں فری ـــ میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

"ضروری کیوں؟"

"پگلی ـــ آخر وہ میری ساس تو ہے ہی نا۔"

"جب ساس کے بیٹے ہی سے ناطہ نہیں رہا ـــ تو پھر ـــ"

فری تو اس کا ناطہ وسیم سے پوری طرح توڑ چکی تھی۔ کیسی موٹی
آسامی کی ناک میں بھی تھی۔ فرید سے مراسم کتنے بڑھا لیے تھے۔ شبّو سے
ملنے کی بھی اسے کتنی فراخدلانہ سہولتیں دے رکھی تھیں۔

شبّو کے دل میں بے شک بغض تھا۔ لیکن اس وقت مرگ کا معاملہ
تھا ـــ

"میں جاتی ہوں فری ـــ مرگ کا معاملہ ہے۔ زمانہ کیا کہے گا۔"

"کہنے دو ـــ جو کہے گا ـــ جب ان لوگوں سے واسطہ ہی

نہیں رکھنا تو پھر جانے کی کیا ضرورت ہے ـــ"

لیکن شبّو مُصر تھی۔

فری نے ماں اور بھائی کو بلا بھیجا ـــ خوب لے دے ہوئی۔ بھائی
تو شبّو سے ناراض تھا۔ اس کا وسیم سے ناراض اور یُوں دھتکار کر چلے آنا
اسے گوارا نہ تھا۔ اب موقع تھا۔ اسی طرح صلح صفائی ہو سکتی تھی۔ وہ شبّو کو
گھر جانے کے لیے اکسانے لگا۔

فیصلہ یہی ہُوا ـــ چونکہ مرگ کا معاملہ ہے۔ اس لیے سب کو جانا
چاہیئے۔ فری کی موٹریں سب وسیم کے ہاں پہنچیں ـــ

دوست احباب رشتہ دار سب جمع تھے۔ شبّو کی عدم موجودگی پر
سب ہی پوچھ پرتال کر رہے تھے۔

لیکن انھیں بتاتا کون؟

ماں تو ان جنجالوں سے منہ موڑ کر ابدی نیند سو رہی تھی۔

وسیم کی حالت ایسے سوالات کی متحمل ہی نہ تھی۔

اور

ملازمہ بیچاری گھر بار سنبھالنے کی فکر میں دوڑ دھوپ کر رہی تھی۔

صحن میں رکھی ہوئی ساس کی میت دیکھ کر شبّو کا دل بھر آیا۔ پٹی پر
سر رکھ کر وہ رو پڑی۔

فری کو اپنے برابر کا کوئی نظر نہ آیا۔ الگ تھلگ ایک کونے میں ماں
کو ساتھ لے کر بیٹھ گئی۔

میت کو غسل دے کر زندگی کے سارے داغوں کو بے داغ کفن سے ڈھانپ دیا گیا۔ رشتہ کی ایک چچی وسیم کے پاس گئی۔ وہ صبح سے اوندھے منہ پڑا تھا۔

"اٹھو وسیم" اس نے شفقت سے اس کی کمر تھپ تھپائی "ماں کا آخری دیدار کر لو۔"

وسیم گم سم سا اٹھ کر صحن میں آ گیا۔ عقیدت کا نذرانہ — آنسو بھی اس کی آنکھوں سے نہ نکلے۔

ایک ٹک ماں کو دیکھے گیا۔

وہ اسے جفاکشی، محنت، مایوسیوں اور محرومیوں کا ڈھیر دکھائی دے رہی تھی۔

"اپنے ہاتھوں سے ماں کا چہرہ ڈھانپ دو وسیم" سرہانے کھڑی کسی عورت نے کہا۔

وسیم جھکا۔ کفن کے دونوں سرے ہاتھوں میں پکڑے اک گہری سانس لی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "تنگ آ کر تم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ماں۔" کئی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

دکھ کا بوجھ کتنا گراں تھا۔ یہ وسیم کی ہر حرکت سے عیاں تھا۔

وسیم نے کفن منہ پر ڈال دیا۔ کسی نے پھولوں کی چادر پکڑائی۔

"یہ بھی ڈال دو۔"

وسیم نے چادر پھیلائی — اچانک اس کی نظر پائنتی کی طرف

کھڑی آنسو پونچھتی ہوئی شبّو پر پڑی۔

خونخوار نظروں سے شبّو کو وہ دیکھتے ہوئے چیخا "اب کیا لینے آئی ہو یہاں۔ کس نے بلایا تمہیں —"

عورتیں بیچ بچاؤ نہ کر دیتیں۔ تو شاید وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح شبّو کی گردن دبوچ لیتا — شبّو جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ وسیم نے اسے بے نقط سنا ڈالیں۔

شبّو کی عدم موجودگی کا راز سب پر کھل گیا۔

تین چار عورتیں وسیم کو تھام کر کمرے میں لے گئیں۔ وہ غصے سے بپھر رہا تھا۔ شبّو کے ساتھ فری کو بھی خوب سنائیں۔

بھری برادری میں اتنی بے عزتی شبّو کیونکر گوارا کر لیتی۔ فری کی طبع نازک پر تو یہ سب سے زیادہ گراں گزرا۔ وہ تو پہلے ہی آنے کی روادار نہ تھی اس پر یہ افتاد۔

"چلو شبّو — ہم ایک منٹ نہیں ٹھہریں گے یہاں — اٹھو اماں تم بھی" فری نے جیسے حکم دیا۔

جہاندیدہ عورتوں نے سمجھانا چاہا — "شدتِ غم سے بے قابو ہو کر کہہ بیٹھا ہے وسیم — چلو جانے بھی دو — یہ وقت بات بڑھانے کا نہیں — میت کا ہی احترام کرو —"

لیکن توبہ — فری کہاں سنتی تھی۔

شبّو کو گھسیٹ کر ساتھ لے گئی۔

اور

پھر

حالات دن بدن بگڑتے گئے۔ مصالحت اور مفاہمت کی سبھی
راہیں بند ہو گئیں۔

فری نے طلاق لینے کی تجویز پیش کی۔ روایتوں کی قائل ماں جھجکی۔ وفا
کے پاسبان بھائی نے مخالفت کی۔ شبّو کی روح کے تار ہل گئے۔ لیکن فری
دلائل، رعب اور دولت کے بل بوتے پر اپنی بات منوا کر رہی۔

شبّو کی طرف سے طلاق کا مطالبہ کر دیا گیا۔

رشتہ داروں نے صلح صفائی کروانے کی سر توڑ کوشش کیں۔

دوست احباب نے بربادی کی آخری مُہر ثبت ہونے سے پہلے مخلصانہ
کوششیں کیں۔ لیکن مطالبہ اپنی جگہ رہا۔

حالات بد سے بدترین ہو چکے تھے۔

وسیم کے دل کے کسی نامعلوم گوشے سے اب بھی شبّو درد بن کر
لپٹی ہوئی تھی۔ وہ اس پر زیادتی بھی کر چکا تھا۔ غم و غصے میں بُرا بھلا بھی کہا تھا۔
تھا۔ لیکن جُوں جُوں دن گزر رہے تھے۔ شبّو کی اہمیت سے اسے انکار نہ رہا
تھا۔ دل اب بھی اسے چاہے جا رہا تھا۔ گھر کی ویرانی بھی اس کی طالب تھی اور
سب سے بڑی زنجیر تو لبنیٰ تھی۔ بچی اور اس کے مستقبل کا خیال طلاق جیسا
انتہا کو پہنچا ہوا قدم اٹھانے سے وہ گریزاں تھا۔

دوستوں اور رشتہ داروں کے کہنے پر اس نے پچھلی ہر رنجش کو بھلا
دینے پر بھی اپنے آپ کو آمادہ کر لیا ——— لیکن اس کی کسی پیش کش کو پذیرائی
نہ بخشی گئی۔

اور

پھر اس نے سُنا کہ اگر اس طرح طلاق نہ ملی۔ تو شبّو عدالت کا دروازہ
کھٹکھٹائے گی ——— حالات میں اتنا کھچاؤ آ چکا تھا۔ کہ اب ٹوٹ جانے
کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔

وسیم نے آخری فیصلہ سے پہلے شبّو سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔
لیکن یہ پیغام فری تک پہنچتے ہی مسترد ہو گیا۔

طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا ———

کاغذات مکمل ہو گئے۔

اور

جب وہ ان کاغذات پر دستخط کر رہا تھا۔ تو اس پر وہی کیفیت طاری

تھی۔ جوہاں کی میت آخری مرتبہ دیکھنے پر پہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سارے بدن پر رعشہ تھا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔

دستخط کر دینے کے بعد نڈھال ہو کر وہ کرسی پر اس نعش کی طرح گر گیا۔ جس کے گلے پر بیدردی سے چھری پھیر دی گئی ہو۔

آہ وہ شکستہ دل جو سنبھالنے کی کوشش میں ٹوٹ جائے۔

طلاق ہو گئی۔

اسحاق نے جب طلاق نامہ فری کے ہاتھ میں دیا تو اس کا دل اک بار تو بے اختیار ہو کر دھڑک گیا۔

"لو بھئی ــــ شبّو کی جان چھوٹی ــــ ویسے مجھے وسیم بیچارے پر بڑا ترس آیا ــــ" اسحاق نے کہا۔

فری کا سر جھک گیا۔ رنگ کچھ پھیکا سا پڑ گیا۔ ندامت کا بھرپور احساس اس پر غالب تھا۔ اسحاق کی بات کا جواب دیئے بغیر وہ چپ چاپ کاغذ ہاتھ میں لیے کمرے سے نکل گئی۔

شبّو نے خود طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔ وسیم سے اچھی خاصی ہمدردی ہوئی تھی ضمیر کی چبھن پر مستقبل کا سُہانا تصور غالب بھی آچکا تھا۔

لیکن

اس کے باوجود

جب فری نے اسے طلاق نامہ پکڑایا تو وہ گنگ سی ہو گئی ــــ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئلوں کی طرح دہکتے جذبات ایک دم سے برف کے

گولے بن گئے ہوں۔

"چلو قصہ ختم ہوا۔" فری کے ہونٹوں پر پھیکی سی ہنسی تھی۔

شبّو بھی جواباً مسکرائی ــــ لیکن اُف یہ مسکراہٹ ــــ جیسے کسی مقتول نے آخری ہچکی لی ہو ــــ

فری شبّو کے جذباتی پن سے آگاہ تھی۔ اس لیے اسے تنہا چھوڑ دینا ضروری سمجھا چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔ یوں بھی اس وقت اسے بات کرنے کو کوئی موضوع موزوں نظر نہ آیا تھا۔

شبّو نے تہہ شدہ کاغذ کھولنے کی جرات نہیں کی۔ وہ اس کاغذ کو دیکھتی رہی۔ آنکھیں کھولے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

اس کاغذ نے اس کے اور وسیم کے درمیان جتنے ذہنی، روحانی، جسمانی رشتے تھے منقطع کر دیے تھے۔ اب اس کا وسیم سے کوئی ناطہ نہیں تھا۔ کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔

لیکن سوچ سوچ کر بھی وہ یہ بات باور نہ کر سکی۔ کہ کاغذ کا یہ ٹکڑا اتنی طاقت و اہمیت رکھتا ہے۔

وسیم!

وسیم کو تو وہ اپنے آپ سے بھی زیادہ جانتی تھی ــــ آنکھیں بند کر کے اسے لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سُن کر اسے جان لیتی تھی۔ اسے کن باتوں میں غصہ آتا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اس کے پیار کرنے کے انداز کیا تھے۔ اسے پتہ تھا۔ وہ چہکتا کب اور چُپ کیوں ہوتا تھا۔ اسے سب

علم تھا۔

پھر

پھر یہ کاغذ کا ٹکڑا ——— ان سب بندھنوں کو کیونکر کاٹ سکتا تھا؟

پاگلوں کی طرح سوچتی گئی۔

اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

اس کا جی چاہا چیخ بن کر فضا میں تحلیل ہو جائے۔

"وسیم ——— وسیم ———" بے اختیار ہو کر اس نے کاغذ پر سر رکھ دیا۔
اور یوں رونے لگی جیسے کاغذ نہیں وسیم کی میت پر سر رکھے رو رہی ہو۔

شنتو پر کئی دن ذہنی پریشانی مسلط رہی۔ اس کا دل ہر وقت خوفزدہ سا رہتا۔ اس مجرم کی طرح جو کسی کو بے گناہ قتل کر بیٹھا ہو ——— رات کے سناٹوں میں تو اس پہ مجنونانہ سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ساری ساری رات وہ کمرے کے چکر لگاتے گزار دیتی ———

جرم کا احساس اس وقت اور بھی شدت اختیار کر جاتا۔ جب لبنیٰ ابو کے لیے مچل جاتی اور "امی گھر چلو" کی رٹ لگا دیتی۔

لبنیٰ کی باتیں زہریلی اور نوکیلی میخوں کی طرح اس کے دل میں اتر جاتیں۔ وہ حالات کے اس موڑ پہ آ کھڑی تھی۔ جہاں معصوم لبنیٰ کے استفسار پہ وہ گم گشتہ منزل کا پتہ نہ دکھا سکتی۔ ایسے لمحوں میں اسے اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی۔ اپنی خود غرضی سے کانپ جاتی۔

اس نے اپنی خاطر معصوم بچی کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اس کا مستقبل

مشکوک بنا دیا تھا۔ اک مطلقہ عورت کی بچی کا مستقبل کیا ہو سکتا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر کانپ اٹھتی ——— ننھی لبنیٰ کو سینے سے لگا کر دیوانوں کی طرح پیار کرتی ——— اسے چھاتی سے لگا کر اتنا دباتی۔ کہ گھبرا کر وہ چیخ اٹھتی۔

شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ شبّو اپنے کمرے میں سنگار میز کے سامنے کھڑی تھی۔ آسمانی سلک کی ساڑھی اور گہرے میک اپ میں وہ قیامت بنی ہوئی تھی۔

بناؤ سنگار کا آخری جائزہ لینے کے لیے اس نے لمبوترے شیشے میں اپنا سراپا دیکھا۔

آئینے میں اپنی آنکھیں دیکھ کر اسے جھرجھری سی آ گئی۔ وہ ان آنکھوں سے کتنی خوف زدہ تھی آجکل ــــ ماضی کے جھروکے جو تھے ــــ کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھیں ــــ ماضی کی کوئی جھلکی نظر آ ہی جاتی تھی۔

آج بھی ان آنکھوں نے کہہ دیا ــــ "شبّو یہ رنگ وسیم کو کتنا پسند تھا۔ شبّو کا جسم کپکپا اُٹھا۔

اس کے کانوں میں سرشار سے لہجے میں کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ یہ رنگ پہن کر میرے صبر کا امتحان نہ لیا کرو شبّو ــــ نیلے نیلے

آسمان پہ چودھویں کا چاند دیکھا ہے کبھی ــــ اس چاند کو صرف دیکھ سکتے ہیں ــــ لیکن یہ چاند ــــ" اور پھر اسے یوں لگا جیسے اسے کسی نے بانہوں میں لے لیا ہو ــــ

اُف وہ آسودگی سے بھرپور پیار ــــ!

شبّو کانپ گئی۔

جلدی سے وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

"تیار ہو گئیں شبّو؟" برآمدے سے فری نے پوچھا۔

شبّو نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"جلدی آؤ۔" فری دروازے میں کھڑی بولی ــــ "سلیم کب سے بیٹھا انتظار کر رہا ہے ــــ"

جلدی آنے کی تاکید کر کے فری لوٹ گئی۔

شبّو نے ساڑھی کا لہراتا پلّو شانے پہ ٹھیک کرنے کی غرض سے پکڑا ــــ

اسے دیکھا۔

اور

پھر

ساڑھی اتار پھینکی۔

اس کے اعصاب پہ جھنجھلاہٹ سوار تھی۔

اس نے ساڑھی پلنگ پہ پھینک دی ــــ جھنجھلاہٹ غصہ

بن گئی ۔۔۔

آسمانی ساڑھی جیسے اس کے اعصاب پر مسلط تھی۔ اس نے جھپٹ کر
ساڑھی اٹھائی۔ غصے سے دانت پیستے ہوئے اسے گول مول کر کے
الماری میں کپڑوں کی تہوں کے نیچے چھپا دیا۔

زور سے الماری بند کر کے وہ الماری سے ہی کمر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔
اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔

وسیم ۔۔۔ وسیم ۔۔۔

وسیم کسی خوفناک بدروح کی طرح اس کے ذہن سے چپک گیا تھا۔
مشغولیت بھی اسے ذہن سے دور نہ کر سکی ۔۔۔

کئی لمحے وہ ہیجانی جذبات سے نڈھال سی کھڑی رہی۔

ملازمہ اسے بلانے کے لیے آئی ۔۔۔ بیگم صاحب! آپ کا انتظار
ہو رہا ہے ۔۔۔ جلدی کیجئے ۔۔۔!

اک گہرا سانس لے کر وہ اپنی جگہ سے ہٹی ۔۔۔ وہ خوف زدہ سی نظر
آ رہی تھی۔ سینے میں متلاطم ہیجانی جذبات کو خود اپنے ہی سے چھپانے کی
کوشش میں وہ جھنجلا گئی۔ الماری کھولی۔ دوسرے کپڑے نکالے۔

پھر کھٹاک سے الماری بند کر دی۔

جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ آئینے کی طرف جانے کی وہ جرأت ہی
نہ کر سکی۔

وہ جلدی جلدی تیار ہو کر کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی ۔۔۔ وسیم کا خیال

ذہن سے زبردستی نکال کر وہ سلیم کے متعلق سوچنے لگی۔

آجکل اس کا زیادہ وقت سلیم کے ساتھ گزر رہا تھا۔ فرید سے میل جول
کم ہو چکا تھا۔ اس کے تو نام سے اب اسے نفرت تھی۔ کتنا بہلایا پھسلایا
تھا فرید نے ۔۔۔ پھر بھی دوسری شادی پر آمادہ نہ ہوا تھا۔

سلیم کے ساتھ ابھی شادی کے متعلق بات چیت تو نہ ہوئی تھی
لیکن معاملہ حوصلہ افزا تھا۔ فرید سے کئی لحاظ سے اچھا تھا۔

گلابی ساڑھی کا پلو کندھے پر پھیلاتے ہوئے اس نے باریک
ڈوریوں والا سینڈل پہنا۔

"امی!" عین اس وقت لبنیٰ نڈھال نڈھال قدموں سے چلتی کمرے
میں آ گئی۔

"ہوں!" شبو نے بغیر دیکھے کہا۔

ماں کو تیار ہوتے دیکھ کر تجسس سے پوچھا "امی ابو پاس جا رہی ہیں؟"

"لبنیٰ!" وہ چیخی ۔۔۔ اس کا ہاتھ اٹھا۔ اور اک زوردار تھپڑ لبنیٰ
کے پھول سے رخسار پر پڑا۔

منی سی بچی سکتے میں آ گئی۔ گال پہ ہاتھ رکھ کر ماں کی طرف دیکھتی رہ
گئی ۔۔۔

"کم بخت ۔۔۔ چوبیس گھنٹے ایک ہی رٹ ۔۔۔ آئندہ ابو کا نام
لیا تو زبان کھینچ لوں گی ۔۔۔"

وہ تند لہجے میں بولی ۔۔۔ "سکون لوٹ لیا ہے باپ بیٹی نے میرا۔"

کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ٹھنڈ کر رہ گئے۔

شبو نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔

نعو ان نظروں کا مفہوم تو نہ سمجھ سکی۔ ہاں سسکیاں لیتے لیتے وہ ایک دم زور سے رو پڑی۔

ایسے کئی واقعات لپیٹ میں لیتے ہوئے شب و روز گزرتے رہے۔

لیکن

بھلا ہو وقت کا ــــ کتنے مجرّب مرہم کا کام دیتا ہے۔ یہ زخموں کے لیے۔ وقت کا بے نظیر مرہم اور فری جیسا ماہر معالج ــــ شبو کے زخم جلد ہی بھرنے لگے۔

فری اسے اونچی سوسائٹی میں لے نکلی ــــ بڑے لوگوں سے میل ملاپ بڑھایا۔ کلب کا ممبر بنوایا۔ سیر و تفریح کے پروگرام بنائے۔ اس نے شبو کو اتنا مصروف رکھا۔ کہ وہ وسیم کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہ نکال سکی۔

زخموں کی کسک سے انحراف تو نہیں۔ ہاں ان کی اذیت سے شبو کو چھٹکارا ضرور مل گیا۔

کسی موٹی آسامی کو پھانسنے کے لیے فری نے خاصہ پروگرام بنایا ہوا تھا۔ فرید سے بات طے نہ ہو سکی۔ تو اس نے سلیم کو شبو سے ملنے کی فراخ دلانہ سہولتیں دے دیں۔

لیکن شادی پہ سلیم بھی رضامند نہ ہوا ــ "شبو جیسی نایاب عورت کی تمنا کوئی بدبخت ہی نہ کرے گا۔ لیکن ایک ہی بیوی کا بار کچھ کم نہیں۔ اور پھر مجھے اپنے بچوں کے مستقبل کا بھی خیال ہے ــــ"

اس نے صاف جواب دے دیا۔

شبو نے اس انکار کو اپنی بے عزتی جانا ــــ لیکن فری اس اخلاقی دائرے میں پہنچ چکی تھی۔ جہاں ایسی ایسی معمولی باتوں کے لیے بے عزتی کا سوال ہی نہیں اٹھایا جاتا۔

"فکر کی بات نہیں شبو ــــ میں جانتی ہوں۔ یہ بہانے ہیں ان لوگوں کے۔ دراصل یہ لوگ مطلقہ سے گھبراتے ہیں ــــ"

فری کی یہ بات شبو کے سینے میں تیر کی طرح لگی۔ اسے یوں لگا جیسے
وہ کوئی گلا سڑا مال ہو۔ جس پہ گاہک بولی دیتے ہوئے جھجک جاتے ہوں۔
فری مایوس نہیں ہوئی۔ کلب میں اس کی ملاقات بیگم شائستہ کے
بھانجے سے ہوئی۔ بتیس سالہ نوجوان دولت مند بھی تھا اور خوبصورت بھی۔
بیوی پاگل خانے میں تھی۔ دو بچے تھے۔ صرف شراب کثرت سے پیتا تھا۔
لیکن یہ کوئی ایسی برائی تو نہیں تھی۔
انجم کو اس نے دوسرے ہی دن گھر پہ بلایا ــــ پرتکلف سی
دعوت دی ــــ شبو نے بھی اسے پسند کیا۔
بے تکلفی بڑھی ــــ انجم بھی شبو کی طرف بڑھا ــــ آنا جانا بڑھا
فری کو حالات امید افزا نظر آئے۔
اس نے بیگم شائستہ پر اپنا مقصد واضح کر دیا۔
انجم نے بیگم شائستہ سے مشورہ کیا۔ بات معقول تھی۔ لیکن اس نے
ایک شرط لگا دی ــــ شبو بچی کو چھوڑ دے۔
شبو نے سنا تو جیسے اس کے سینے میں بیک وقت کئی تیر چبھ
گئے ــــ بچی کو چھوڑ دینے کا تو وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔
"پرائی اولاد کون گلے لگاتا ہے شبو ــــ اتنا اچھا آدمی پھر کہاں
سے ملے گا۔ بچی جس کی ہے۔ اس کے حوالے کر دو ــــ کیوں اتنی سی بات
کے لیے بنا بنایا کام بگاڑ رہی ہو ــــ" فری نے بڑے جہاں دیدہ انداز
میں بہن کو سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن
شبو کسی طور اس پر آمادہ نہ ہو سکی۔
اس رات وہ ببلی کو گلے سے لپٹا کر کس قدر روئی ــــ صبر و جبر کے
سارے ہی بند ٹوٹ گئے ــــ خود غرضی کا لبادہ جھیر جھیر ہو کر گر پڑا۔ اور
اصلی شبو جس کے سینے میں ممتا کا سمندر موجزن تھا۔ تڑپ تڑپ گئی۔
فری کی کوششیں جاری رہیں۔ اسے شبو کا فکر تھا۔ وسیم کے سہارے
اس کی زندگی جیسی بھی تھی گزر تو رہی تھی۔ یہ سہارا اسی نے گنوایا تھا۔ اب کسی
مضبوط سہارے کی تلاش اسی کا فرض تھا ــــ اور اس فرض کو نبھانے کے لیے
وہ سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔
انجم کے بعد نواز فری کی توجہ کا مرکز بنا۔ ارشد کا دوست نواز کسی دوسرے
شہر میں رہتا تھا۔ کبھی کبھار ارشد کے پاس آتا ــــ وہیں فری کی ملاقات اس
سے ہوئی۔
پچاس سالہ نواز کی پہلی بیوی موجود تھی۔ لیکن وہ اس کے وجود سے غافل
ہو چکا تھا۔ وہ تو اب کھوکھلا ڈھانچہ تھی۔ اس کا حسن جوانی اور رعنائیاں سات
بچوں کے وجود میں ڈھل چکی تھیں ــــ نواز ایک سوشل بیوی کی ضرورت محسوس
کر رہا تھا۔ یوں بھی دولت بڑھانے کے کچھ ذرائع جب سے ہاتھ لگے تھے
وہ نئی بیوی کی مانگ شدت سے محسوس کر رہا تھا۔
فری نے اس سے میل ملاپ بڑھایا۔
نواز نے شبو کو پسند کیا۔

لیکن

اس نے بھی وہی شرط عائد کی —— بچّی کا وجود ایک بار پھر حائل ہوا اور شنو
نے پھر اسی شدّت سے مخالفت کی۔

گھر کی فضا کچھ مکدّر سی ہو گئی۔ اسحاق کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔

فری کو شنو پر غصّہ آ گیا —— "اسی دم چھلّے کو لیے پھرنا تھا۔ تو پھر وسیم
ہی سے نباہ کر لیتیں۔ اپنے ساتھ تم مجھے بھی لے ڈوبو گی۔ کیا کیا پاپڑ بیلتی
ہوں تمھارے لیے —— اسحاق کو یہ باتیں بالکل پسند نہیں۔ ایک تم ہو
کہ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ وسیم کو بھی برباد کیا اور اپنے پاؤں پر بھی کلہاڑی مار رہی ہو
—— کہیں نہ کہیں تو تمھیں ٹھکانہ کرنا ہی ہے۔ کب تک یونہی بیٹھی رہو گی۔"

شنو سر جھکائے سنتی رہی —— اس کی ممتا میں درد و کرب کی کتنی ٹیسیں
اٹھ رہی تھیں۔ یہ کچھ اس کا دل جانتا تھا۔

"آخر تمھارا ارادہ کیا ہے؟" فری نے سنجیدگی سے پوچھا۔

شنو کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ سوچوں
میں گم تھی۔ اس نے فری کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"جو بھی فیصلہ کرنا ہے کر لو۔ پانچ چھ ماہ گزر گئے۔ آخر کب تک بیٹھی
رہو گی —— میرے گھر کی فضا خواہ مخواہ مکدّر ہو رہی ہے —— نواز کے
ساتھ شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتیں۔ تو تمھاری مرضی —— اماں کے
ہاں چلی جانا —— مجھے معلوم ہے —— کہ اسحاق اب تمھارا یہاں رہنا
پسند نہیں کرتے —— جو راستہ پسند ہے اپنا لو —— میں اپنی زندگی برباد

کرنے کو تیار نہیں ——"

وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی —— شنو کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔
اب تک اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ کہ وہ کسی اور کے گھر پر بار بنی بیٹھی ہے

وہ ذہنی کشمکش میں پھنس گئی۔ فری کی باتوں نے حقیقت کی جان لیوا تلخی
سے روشناس کرایا تھا۔ اماں کے گھر جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہاں تو بھا
بھائی تھے —— طلاق کی انھوں نے کس شدّت سے مخالفت کی تھی۔ اور
اب بھی وہ اسے منہ نہ لگاتے تھے۔

نواز سے شادی کرنے کے لیے اسے لبنیٰ کو قربان کرنا پڑتا تھا ——
سے جدائی کا تصوّر بھی اسے گوارا نہ تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔ فری کا مزاج ہر وقت بگڑا
رہتا —— اسحاق کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔ شنو مزاجوں کے اتار چڑھاؤ سے
ناواقف نہ تھی۔ اپنی زندگی کا بھی خیال تھا۔ بات بن بن کر بگڑ رہی تھی۔ اسے
کچھ نہ کچھ فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔

وہ جتنا سوچتی اتنا الجھتی —— سیدھا سادا سا مسئلہ دقیق بن گیا
تھا۔ لبنیٰ کو جدا کرنے کی ہمّت نہ پاتی تھی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر اب تک
وسیم سے وابستہ تھی۔ لبنیٰ اس وابستگی کا واسطہ تھی۔ اور اسی لیے لبنیٰ اسے
کچھ زیادہ ہی عزیز ہو گئی تھی۔

بنی کی طبیعت دو دن سے خراب تھی۔ شام کو حرارت بھی ہو جاتی۔
سارا دن ریں ریں کرتے گزرتا ــــ شبّو اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی ــــ
ڈاکٹر نے دوائی دی ــــ کھانے پینے کی ہدایت کی ــــ وہ بچّی کے لاشعور
میں سسکتی خواہش کو جان بھی کیسے سکتا تھا ــــ بنی ابو کے لیے مچل رہی
تھی نا؟ ــــ شبّو نے جب سے اسے ڈانٹا تھا۔ وہ ابو کا نام بہت کم
زبان پر لاتی لیکن دل!
کون جانے اس ننھے سے دل کی دھڑکنوں پر ابو کا نام کس کس
طرح آتا تھا۔ دوائی لے کر شبّو بنی کا ہاتھ پکڑے ڈاکٹر کی دکان سے نکلی۔
اور موٹر میں آ بیٹھی۔ ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔
موٹر بڑے بازار کے چوک سے دائیں طرف مڑ گئی۔ بازار کچھ گنجان
آباد تھا۔ ڈرائیور نے رفتار دھیمی کر دی۔
بنی کھڑکی میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی اور شبّو پاس ہی بیٹھی دوائیوں

کی شیشیاں اُلٹ پلٹ کر رہی تھی۔ اس کا ذہن کسی اور ہی عقدے کے حل میں
اُلجھا ہُوا تھا۔
ڈرائیور احتیاط سے راستہ بنا رہا تھا۔ دائیں بائیں پیدل چلنے والے
گزر رہے تھے۔ اتنی بڑی موٹر اور راستہ کچھ تنگ تھا۔
"بنی" شبّو نے پیار سے اسے پکارا۔
"جی" وہ بدستور کھڑکی سے سر نکالے باہر دیکھ رہی تھی۔
"بیٹھ جاؤ بیٹی" شبّو نے دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑ کر بٹھانا
چاہا ــــ
"نہ"
"اچھا تو سر اتنا باہر نہ نکالو۔ کوئی چیز لگ جائے گی۔"
بنی نے قدرے سر اندر کر لیا۔ شبّو پھر دوائیوں کی شیشیاں دیکھنے
لگی۔
"ابو ــــ" بنی نے چیخ نما آواز دی۔
گھبرا کر شبّو نے سر اٹھایا۔
ڈرائیور نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔
بنی کھڑکی سے آدھا دھڑ باہر نکالے بیتابی سے پیچھے دیکھ رہی
تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے۔
"بنی" شبّو نے چیخ کر کہا۔ اس نے اس کا فراک کھینچا۔
"ابو" وہ ایک بار پھر تڑپی ــــ پاؤں اٹھا کر کھڑکی سے کود جانے

کوشش کی۔

شبو نے لپک کر اسے کھینچا۔ کھینچا تانی میں سر گھما کر پچھلے شیشے سے باہر دیکھا۔

کچھ فاصلے پر اسے وسیم دکھائی دیا جو لوگوں کو ہٹا ہٹا کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شبو نے لبنیٰ کو کھینچ کر بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"ابو —— ابو" وہ تڑپ تڑپ گئی۔

"روک دوں گاڑی بی بی جی؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"نہیں —— تیز چلاؤ ——" شبو لبنیٰ کو گود میں چھپاتے ہوئے چیخی "دیکھتے نہیں —— وہ آ رہا ہے —— اسے چھین کر لے جائے گا —— تیز چلاؤ ——"

شبو کا دم یوں پھول رہا تھا جیسے میلوں کی مسافت دوڑ کر طے کر رہی ہو ——

ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔

شبو وحشت زدہ ہرنی کی طرح لبنیٰ کو بازوؤں میں دبوچے بار بار پلٹ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ کہیں وسیم اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔

لیکن تیز رفتار گاڑی کا پیادہ پا وسیم مقابلہ کیسے کر پاتا۔ اس میں یہ صفت ہوتی تو آج حالات ہی اور ہوتے۔

بچی بلک بلک کر روتی رہی۔

شبو گھر پہنچ کر بھی خائف تھی۔

فری نے سُنا تو بڑی سنگ دلی سے بولی "میں ہوتی۔ تو وہیں حوالے کر دیتی اس کے۔ ساری مصیبت خود ہی ختم ہو جاتی ——"

لبنیٰ نے جب سے باپ کو دیکھا تھا رو رہی تھی۔ شبو نے بہتیرے بہلاوے دیئے:

"میں اپنی بیٹی کو ڈھیر سے کھلونے لا دوں گی۔ اور وہ رنگ برنگی ٹافیاں بھی دوں گی —— کتنے پیکٹ لو گی؟"

"ابو پاس جاؤں گی" وہ روتے ہوئے بولی۔

"لبنیٰ —— وہ جھالروں والا فراک لو گی —— وہ —— وہ جو درزی کی دکان پر دیکھا تھا یاد آیا —— تمہارے لیے بھی ویسا ہی بنواؤں گی —— کتنا پیارا لگے گا۔ میری منی کو" شبو نے لبنیٰ کو سینے سے لپٹانا چاہا۔

لیکن

وہ

مچل کر الگ ہو گئی —— "ابو پاس چلو امی —— ابو —— ابو ——" وہ سسک اٹھی۔

"لبنیٰ" شبو نے جھنجھلا کر اس کے منہ پر تھپڑ مارا ——

لیکن آج لبنیٰ سہم کر چپ نہ ہوئی —— بلکہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

شبو کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا کرے۔ لبنیٰ کھلونوں کے وعدے ٹافیوں کے لالچ فراک کے یقین کے بعد تھپڑ کھا کر بھی چپ نہ ہو رہی تھی شبو

نے بھی رونا شروع کر دیا۔

اور شام کے وقت جب فری ان کے کمرے میں آئی۔ تو ماں بیٹی زار و قطار رو رہی تھیں۔

"ایسا جذباتی پن بھی کیا" فری اب کسی ہمدردی کی گنجائش نکالنے کو تیار نہ تھی۔

"آؤ لبنیٰ میرے پاس" اس نے بچی کو بہن کے بازوؤں سے اچک لیا —

"ابو پاس جاؤ گی" فری نے پیار سے پوچھا۔

"ہاں" موٹی موٹی آنکھوں سے آنسو لڑھک آئے۔

"دیکھو لبنیٰ تم چپ ہو جاؤ — پھر ہم تمہیں ابو پاس بھیج دیں گے، تم روتی رہیں تو پھر نہیں بھیجیں گے — سمجھیں — پہلے مسکراؤ۔ ہنسو —"

اور

ابو کی خاطر جب روتی آنکھوں سے لبنیٰ نے مسکرانے کی کوشش کی تو فری کا دل بھی ہل کر رہ گیا۔

وہ بچی کو کمرے سے لے گئی — بہلایا — صبح صبح ابو کے پاس بھیج دینے کا وعدہ کیا۔

بچی بہل گئی — رات تک فری نے اسے اپنے پاس رکھا۔ وہ اسی کے پلنگ پر سو بھی گئی ٭

طلاق کے بعد وسیم دو ماہ کی رخصت لے کر اس شہر سے چلا گیا تھا جہاں اس کی محبت، عزت اور وقار کے لاشے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہوئے تھے۔

وہ لوگوں کے لیے اک موضوع بن گیا تھا۔ ہر کوئی اس سے ہمدردی جتانے کی کوشش کرتا — ان کی ہمدردی درد کا مداوا نہ تھی۔ بلکہ بیشتر زخموں کو اور بھی اذیت دیتا — وسیم کا خون کھول اٹھتا۔ غیرت چرکے کھا کر تڑپ جاتی۔

اس کا سکون لٹ چکا تھا۔ بعض اوقات تو اسے یوں محسوس ہوتا، جیسے سکون کے ساتھ ساتھ اس کے حواس بھی جواب دیتے جا رہے ہیں۔

اسی لیے

دو ماہ کی چھٹی لے کر وہ اس دیار سے دور بھاگ گیا۔ جہاں شعلے ہی شعلے تھے۔

دو ماہ گزر گئے۔ جس سکون کی تلاش میں وہ مارا مارا پھر رہا تھا وہ میسر نہ آسکا۔ پژمردہ طبیعت لیے وہ لوٹ آیا۔ اکیلا گھر کھانے کو دوڑتا۔ تنہائی ڈنک مارتی — وہ بے قرار ہو کر باہر نکل جاتا لیکن زخم خوردہ طبیعت کو کہیں چین نہ آتا۔

اکیلا گھر اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اس گھر کے در و دیوار پر شبّو کی پرچھائیاں تھیں۔ باورچی خانہ میں کسی برتن کے گرنے کی آواز اسے چونکا دیتی۔ لیکن فریبِ خیال پر وہ خود ہی جھنجھلا جاتا — شبّو کہاں۔ وہ تو ملازمہ سے برتن گر پڑا تھا۔

ساڑھے چار سال — پورے ساڑھے چار سال اس گھر میں شبّو کی رفاقت میں گزرے تھے۔

یہ رفاقت — جو بہاروں کے حسن کی طرح نکھری اور خزاؤں کی ویرانی کی طرح بکھر گئی۔

گھر اب بھی وہی گھر تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پہ تھی۔ الماری میں اب تک شبّو کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ لوہے کے صندوق کے نچلے خانے میں اب تک اس کا زیور محفوظ پڑا تھا۔ سُرخ ٹکلیوں والا سہاگ رات کا جوڑا بھی اسی صندوق میں رکھا تھا۔ سب کچھ وہیں تھا۔ ایک شبّو ہی نہیں تھی۔ اگر وہ مر گئی ہوتی۔ تو وسیم کے دل میں صرف درد ہی درد ہوتا۔

لیکن

وہ مری نہیں تھی۔

اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

اونچے محلوں کی خاطر

لمبی لمبی موٹروں کے لیے

سونے چاندی کی ہوس نے خلوص کی تاب داری سے آنکھیں پھیر لی تھیں —

وسیم کے دل کا درد اک بوجھ بن گیا تھا۔

اس درد میں تنفر کے شعلے تھے۔

انتقام کی آگ تھی۔

محبت کا گھاؤ تو شاید بھر جاتا لیکن وسیم کو غم تو اس زخم کا تھا جو اس کی غیرت کے سینے پر لگا تھا۔

شب و روز اپنی ہی آگ میں جلتے گزر رہے تھے۔ پانچ ماہ میں وسیم کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ اس بھری دُنیا میں اک ملازمہ تھی۔ جو اس کی مونس و غمگسار تھی۔ جس نے تلخ حالات میں بھی اس کے ساتھ نباہ کرنے کا عزم کیا ہوا تھا، اسی بوڑھی ملازمہ کے سامنے وہ کبھی کبھی دل کے پھپھولے پھوڑ کر تسکین پانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

اس شام وسیم معمول سے کہیں زیادہ بے چین تھا۔ آج سہ پہر بازار میں اس نے فری کی موٹر میں لبنیٰ کو دیکھا تھا۔

وہ کس طرح دمکی تھی اسے دیکھ کر!

شاید اس نے اسے پکارا بھی تھا۔

پانچ ماہ کے طویل عرصے میں بھی وہ اسے نہ بھولی تھی۔ وسیم موٹر کے پیچھے لپکا بھی تھا لیکن تیز رفتار موٹر اس کی آرزوؤں کو کچلتی ہوئی نکل گئی تھی۔

جب سے وہ بے قرار تھا۔

بچی کے لیے تڑپ رہا تھا۔

وہ لبنیٰ کو سینے سے لگا کر مایوسیوں اور ناکامیوں کی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔

دو چار بار پہلے بھی اس نے بچی کو بلا بھیجا تھا۔ لیکن پندی نے اسے مایوس کر دیا تھا۔ وہ خود بھی چپ ہو کر رہ گیا تھا۔ چار سالہ بچی کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا مسئلہ حل نہ ہو سکتا تھا۔ دل پر پتھر کی سل رکھ کر وہ خاموش ہو گیا تھا۔

لیکن

آج

بچّی کی تڑپ نے اس کے خون میں بجلیوں کی کوند پیدا کر دی تھی۔

وہ نڈھال بے چین اور پریشان سا گھر لوٹا ——

ملازمہ کھانے کے لیے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کھانا لاؤں؟" اس نے وسیم سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ صحن میں رکھے تخت پر بیٹھ گیا۔

"کیوں؟" باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی ملازمہ نے پوچھا۔

"بھوک نہیں ——"

"تھوڑا سا کھا لو بیٹے۔"

وسیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ تخت کے چوبی تکیے سے سر لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کیے وہ لیٹا رہا —— آنکھوں کے سامنے ہمکتی ہوئی لبنیٰ تھی۔

"کیا بات ہے بیٹے؟" ملازمہ نے محبت سے پوچھا۔

"گھر کی بربادی مجھے مار ڈالے گی خالہ جی۔" وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"حوصلہ رکھو —— دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے۔"

وسیم نے سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

ملازمہ کچھ دیر چپ رہی —— وسیم کی حالت اس سے دیکھی نہ گئی —— دبی زبان سے بولی "گھر آباد کر لو —— اس طرح کب ——؟"

"اُجڑے گھر کبھی نہیں بسا کرتے خالہ جی —— اس نے گہری آہ بھری۔

"یوں پہاڑ سی زندگی کیسے گزارو گے؟ گھر آباد کر لو!"

"یہ میں بھی سوچ رہا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

ملازمہ خوش ہو گئی۔

"میں اپنی بچی کو لے آؤں گا۔ میرا گھر آباد ہو جائے گا ——"

"بچی کو —— کیسے لے آؤ گے —— اسے ماں کی بھی ضرورت ہو گی۔ پہلے شادی کر لو۔"

"خالہ جی ——" اس نے ملازمہ کی بات کاٹ دی۔

"دوسری شادی کا نام نہ لو خالہ بی ۔۔۔ خوف آتا ہے ۔۔۔ دنیا کے
سب دُکھ جھیل لیے۔ ایک سوتیلی ماں کا رہ گیا ہے ۔۔۔ تم چاہتی ہو اپنی
بچی کو الجھا کر یہ دکھ بھی دیکھ لوں ۔۔۔"

ملازمہ خاموش ہو گئی ۔۔۔ بے شک وسیم اس کی عزت کرتا تھا اس
کی خدمت گزاریوں کے صلہ میں اسے خالہ بی بنا لیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ملازمہ
ہی تھی نا ۔۔۔ زیادہ دخل دینے کی مجاز نہ تھی ۔۔۔ وہ چپ ہو گئی۔

وسیم نے سہ پہر لبنیٰ کو دیکھنے کا واقعہ اسے سنایا۔

"جب سے اسے دیکھا ہے۔ میرے دل کی جانے کیا حالت ہو
رہی ہے ۔۔۔ میں اسے لے آؤں گا ۔۔۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں
کہا ۔۔۔

"لیکن وہ رہ بھی سکے گی اکیلی ۔۔۔؟"

"کیوں نہیں۔ جن کی مائیں مر جاتی ہیں۔ وہ بچے بھی تو جی لیتے ہیں۔"

کتنا درد تھا وسیم کے لہجہ میں۔ ملازمہ کا دل دُکھنے لگا۔

"خالہ بی ۔۔۔ تم میرا ساتھ دو گی!"

"میرا جینا مرنا اسی چوکھٹ سے ہے بیٹے ۔۔۔ دنیا میں ہے
ہی کون میرا ۔۔۔ مر گئی تو کفن ڈال دینا ۔۔۔ بس ۔۔۔"

خالہ بی! میں لبنیٰ کو لے آؤں ۔۔۔ تو تم ۔۔۔ اسے اپنے پاس
کرنا۔ صرف اتنی دیر۔ جتنی دیر میں دفتر ہوتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں اس
کوئی تکلیف نہ دوں گا۔ رات اسے اپنے پاس ہی سلا لیا کروں گا۔

صرف دفتر کے وقت کی ذمہ داری تم لے لو ۔۔۔"

ملازمہ نے دیکھا وسیم کی گہری گہری خوبصورت آنکھوں میں لاکھوں
التجائیں تھیں۔

"میں تمہاری تنخواہ دگنی کر دوں گا" وہ لجاجت سے بولا۔

"سب کچھ تمہارا ہی ہے بیٹے ۔۔۔ مجھے پیسے کا لالچ نہیں۔
تم بچی کو لے آؤ ۔۔۔" اور پھر دونوں دیر تک بچی کو واپس لانے کا پروگرام
بناتے رہے۔

وسیم نے فیصلہ کر لیا۔ اگر شبو نے بچی کو نہ بھیجا۔ تو وہ کوئی دوسرا
سہارا تلاش کرے گا۔

لیکن
بچی سے اب کسی صورت جدا نہ رہے گا۔

"اب میں اسے کیا جواب دوں۔"

"میں کیا بتاؤں؟"

"بات ختم ہونی چاہیے ہاں یا نہ ——— خواہ مخواہ کسی شریف
کو الجھائے رکھنا کتنی بری بات ہے ———"

"آپ شبّو کو سمجھا دیکھیں ——— شاید کچھ اثر ہو ——— میں ت
گئی ——— بچی کو جدا کرنے کا ذکر بھی گوارا نہیں کرتی وہ تو ——— عجیب
سی عورت بن گئی ہے۔"

"طلاق لی ہی اس لیے تھی۔ اب تو اس کا یہ رویہ مناسب نہیں"

"نواز ہی بچی کو گوارا کر لے۔ تو بات بن جائے۔"

"توبہ کرو ——— کون برداشت کر سکتا ہے ——— اور پھ
وہ اپنے بچوں کو شبّو کی خاطر الگ رکھنے پر آمادہ ہے۔ تو یہ سراسر زیا
ہو گی ——— نواز نے پہلی شرط ہی یہی رکھی تھی۔ کہ بچی کو چھوڑ دے ———

شرافت کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس سلسلے میں اس سے مزید بات نہ کی جائے۔

"تو پھر آپ شبّو کو سمجھا دیکھیں ——— شاید آپ کا کہا مان لے۔"

فری کے ایما پر اسحاق شبّو کو سمجھانے کے لیے تیار ہو گیا۔

رات کھانا کھانے کے بعد تینوں ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے۔

فری کسی کام کے بہانے اٹھ کر چلی گئی۔

شبّو لبنیٰ کا پیازی سویٹر بُن رہی تھی۔ آتش دان میں جدید طرز کا ہیٹر
جل رہا تھا۔ سفید ساڑھی میں شبّو بڑی معصوم نظر آ رہی تھی۔ ہیٹر پر نظریں جمائے
وہ سلائیاں چلا رہی تھی۔ گاہے گاہے کوئی خانہ سلائی سے الجھ جاتا۔ وہ
بے خیالی ہی میں ٹھیک کر کے پھر ہیٹر پر نظریں جما دیتی۔

"شبّو!" کچھ دیر خاموشی سے رسالہ دیکھنے کے بعد اسحاق نے اسے
پکارا۔

"جی" وہ آہستگی سے بولی۔

"نواز آج شام آیا تھا۔"

"جی"

"پھر تم نے کیا سوچا؟"

وہ چپ رہی۔

"نواز اچھا آدمی ہے۔ خواہش مند بھی ہے۔ پیسہ بھی کافی ہے
یہ رشتہ بھی محض جذباتی پن سے گنوا دینا ٹھیک نہیں۔ تم اتنی ناسمجھ بھی
نہیں ہو ——— جو مجھے بات کی وضاحت کرنا پڑے ——— بچی کی وجہ سے؟"

"اسحاق بھائی!" شبو کی آواز رندھ گئی۔

"سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ شبو ـــــ یہ موقعہ پھر نہیں ملنے کا ـــــ طلاق لی ہی کس لیے تھی ـــــ"

شبو کا سر جھک گیا۔ ندامت کا بار تھا نا؟

"کل آخری فیصلہ کے لیے نواز آئے گا ـــــ تمھیں ہاں یا نہ کا آخری فیصلہ کر لینا چاہیئے۔"

شبو سوچ میں ڈوب گئی ـــــ طلاق اسی لیے تو لی تھی۔ زندگی کی چمک دمک نے تو اس کی آنکھیں خیرہ کی تھیں۔ اب یہ چمک دمک اس کے قدموں میں مچلنے کو تیار تھی۔

لیکن

نہ جانے۔

دل کے کن بے نام جذبوں سے خوف کھا کر وہ اس چمک دمک سے دُور بھاگنا چاہتی تھی۔

"بچّی کے لیے تمھارا جذبہ محبت حق بجانب سہی ـــــ لیکن اتنی سی بات کے لیے اپنی زندگی تباہ کر لینا بھی تو ٹھیک نہیں ـــــ اور پھر کچھ عرصے کی تو بات ہے۔ شادی کے بعد نواز کو جس طرح ڈھالو گی ڈھل جائے گی۔ اسے راغب کر لینا ـــــ پھر بچّی کو پاس بلا لینا کون سی بڑی بات ہو گی ـــــ" اسحاق نے سنجیدگی سے کہا ـــــ "پیار محبت سے اسے بچّی واپس لانے پر آمادہ کر لینا ـــــ عورتیں تو بہت کچھ منوا لیتی ہیں۔

شوہروں سے ـــــ نئی بیوی کی دلجوئی کی خاطر نواز بھی مان جائے گا۔"

"لیکن ـــــ وُہ ـــــ؟"

"کیا؟"

"وہ واپس نہیں کریں گے لبنیٰ کو ـــــ تو پھر میں کیا کروں گی اسحاق بھائی۔"

"یہ کوئی مشکل نہیں۔ تم قانون کا سہارا لے سکتی ہو ـــــ کم از کم سات سال کی عُمر تک تم اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہو ـــــ یہ بعد کی بات ہے جس طرح ہو اسمیٹ لیں گے ـــــ تم اب کی بات کرو ـــــ"

اسحاق نے بڑی سہانی دنیا کے خواب شبو کو دکھائے۔ وہ مرعوب ہو گئی ـــــ اس کی زبان گنگ تھی۔ اور وہ اسحاق کی باتیں بڑے غور سے سُن رہی تھی۔

دورانِ گفت و گو فری بھی آپہنچی ـــــ شوہر کا ساتھ بڑھ چڑھ کر دیا۔ شبو کے لیے حامی بھر لینے کے سوا چارہ نہ رہا۔

"میری پیاری بہن!" فری نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ شبو جواباً مسکرا تک نہ سکی ـــــ اسے تو یُوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی وزنی پتھر سے بندھی وہ سمندر کی گہرائیوں میں اُترتی جا رہی ہو۔

اسحاق اور فری کل کا پروگرام طے کرتے رہے۔ شبو اُٹھ کر چلی گئی

"بڑی جذباتی ہے۔" فری نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"قدرتی بات ہے ـــــ وسیم کے ساتھ اس نے چار پانچ سال

گزارے ہیں — لگاؤ ختم ہوتے ہوتے ہی ہوگا نا؟ — علیحدگی کو ابھی پانچ چھ ماہ ہی ہوئے ہیں نا! — مجھے خود بیچارے پر ترس آتا ہے۔ پیسے ہی کی کمی تھی — اور کیا نہیں تھا اس کے پاس — شکل وصورت — اخلاق — مہر ومحبت میں کسی سے کیا کم تھا؟

فری اس ذکر سے کچھ مشتعل سی ہو رہی تھی — وہ اٹھی۔

"کہاں؟"

"ذرا شبو کو دیکھوں، کیا کر رہی ہے —"

"میری پیشن گوئی ہے کہ رو رہی ہوگی۔"

"رونا کس بات کا — اب خود ہی تو حامی بھری ہے — اس نے — میرا خیال ہے۔ کل لبنیٰ کو اس کے باپ کے پاس بھجوا دیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیں گے۔"

"ہاں — ہاں۔"

"آپ نواز سے کل سارا معاملہ طے کر لیں۔ نکاح کی تاریخ بھی مقرر کر لیں۔ ہفتہ عشرہ میں سب کچھ ہو جانا چاہیئے کہیں شبو پھر ارادہ نہ بدل لے —"

وہ ہنس دی۔

اسحاق بھی مسکرایا — "کوئی شک بھی تو نہیں۔"

"واہ جی — اب بھلا ہم اس کی کہاں مانیں گے۔ آپ کل ہی تاریخ

مقرر کر لیں۔"

"ہاں یاد آیا — نواز کچھ چیزیں خریدنے کا کہہ رہا تھا —
لیے اس کی خواہش ہے۔ کہ شبو اپنی پسند کی چیزیں خود اس کے
جا کر خرید لے۔"

"سب ہو جائے گا — پہلے آپ تاریخ کا تعین کر لیں

وہ یہ کہتے ہوئے ڈرائینگ روم کا بھاری پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی
کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے دھیرے سے پردہ سرکا کر
اسحاق کی پیشن گوئی ٹھیک ہی تھی۔

شبو سوئی ہوئی لبنیٰ کے گال سے گال لگائے زار وقطا
تھی۔ فری کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا۔

وہ اندر جانے کی ہمت نہ کر سکی۔

نڈھال سی ہو کر وہ لوٹ گئی۔

ناشتے کے بعد فری اور شبّو باہر لان میں آ بیٹھیں۔ رات بھر رونے سے
شبو کی آنکھیں متورم تھیں۔ لیکن اس وقت وہ پُرسکون سی نظر آ رہی تھی۔ شاید جی
بھر کر ماتم کر لینے کے بعد اسے صبر آ گیا تھا۔

فری نے جان بوجھ کر نواز کی امارت کا ذکر چھیڑ دیا۔

"اس نے حال ہی میں نئے ماڈل کی گاڑی خریدی ہے۔ راشد کہتا
ہے اس کے پاس بڑی دولت ہے — کوٹھی کا ساز و سامان دیکھ کر
انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ کتنی خوش نصیب ہو تم شبّو — میں تمہارے
پاس آ کر کتنا فخر محسوس کیا کروں گی۔"

شبو کی حالت اس بچے کی سی تھی۔ جیسے کھلونے دے کر بہلایا جا
رہا ہو —

"نواز تمہاری پسند کا زیور اور کپڑا خریدنا چاہتا ہے — وہ چند
دنوں تک آئے گا — شبّو خوب قیمتی ساڑھیاں خریدنا —!"

شبو بہلی بہلی سی بیٹھی رہی —

"لبنیٰ کو آج شام تیار کر دینا — ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیں گے"
فری نے موقع پا کر کہا۔

شبو کا سانس جیسے رک گیا۔ لیکن دل پر جبر کر کے اچھا کہہ دیا۔ دونوں
بہنیں باتیں کرتی رہیں۔

"بیگم صاحب" ملازم کی آواز پر فری نے سر گھما کر دیکھا۔

"کیوں؟"

"اُن کی ملازمہ آئی ہے۔"

"کن کی؟"

نوکر نے شبّو کی طرف اشارہ کیا۔ شبو کا دل دھڑک کر رہ گیا۔

"کہاں ہے —" فری نے پوچھا۔

"برآمدے میں"

"کس لیے آئی ہے؟"

"پتہ نہیں بیگم صاحب کو پوچھ رہی ہے۔"

"اسے یہاں بھیج دو —!"

"صبح صبح کیوں کر آ گئی ملازمہ — لبنیٰ کو لینے آئی ہو گی" شبو نے
دھڑکتے دل سے کہا۔

ملازم چلا گیا۔ اور کچھ دیر بعد بوڑھی ملازمہ آ گئی — ادب سے سلام
کر کے اس نے آنے کا مدعا بیان کیا۔

شبّو کوشش کے باوجود ملازمہ سے نظر نہ ملا سکی — کتنا طنز تھا
اس کی نظروں میں — شبّو تاب نہ لا سکی۔

"صاحب نے چند دنوں کے لیے بچّی کو بلایا ہے — بیگم صاحبہ
اب انکار نہ کیجیئے گا۔"

"تم جتنے عرصے کے لیے چاہو اسے اپنے پاس رکھنا۔" فری نے بہت
لاپروائی سے کہا۔

"سچ!" ملازمہ کی باچھیں کھِل گئیں۔

"سچ نہیں تو کیا جھوٹ — " جس کی اولاد ہے اس کا بھی تو حق ہے
اس پر — تم یہیں بیٹھو ہم بچّی کو ابھی تیار کر دیتے ہیں۔"

فری کے کہنے پر ملازمہ بیٹھ گئی۔

لیکن

شبّو کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔

"آؤ شبّو — لبنیٰ کے کپڑے نکال دو — " فری نے شبّو کا
ہاتھ پکڑ کر کہا۔

وہ اسے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ کمرے میں پہنچ کر پیار سے بولی۔
لو جلدی کرو — ہاں کسی جذباتی کمزوری کا مظاہرہ نہ کرنا — ورنہ ملازمہ
ایک کی چار چار لگائے گی جا کر — تم لبنیٰ کے کپڑے بکس میں بند کرو۔
میں اس کو لاتی ہوں۔"

شبّو گم صُم سی کھڑی رہ گئی — اس کی ممتا کس طرح تڑپ رہی تھی

فری کو کیا احساس ہوتا۔

کچھ دیر بعد وہ لبنیٰ کو لے کر آ گئی — وہ ابو پاس جانے کا سن کر
پھول کی طرح کھل اٹھی تھی۔

خوشی خوشی اس کے کپڑے بدلے۔ پیلے فراک میں وہ کتنی پیاری
لگ رہی تھی۔

فری نے اسے نیلا سویٹر پہنا کر بالوں میں پیلا ربن باندھ دیا۔

"یہ بھی اچھا ہی ہوا — جو وسیم نے بچّی کو بلا بھیجا — " فری نے
لبنیٰ کے گھونگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ہم خود بھیج
دیتے۔ تو اچھا نہ تھا۔"

شبّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہونٹ کاٹتے — آنسو پیتے ہوئے
وہ لبنیٰ کی چیزیں بکس میں ڈال رہی تھی۔

بکس بند کر کے وہ نڈھال سی کرسی پر گر گئی — بچّی پھولے پھولے
فراک میں اِدھر اُدھر گھوم کر ابو پاس جانے کی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

"شبّو" فری نے اسے پکارا۔

وہ کرسی پر سر ٹکائے آنکھیں بند کیے پڑی تھی — آنسو آنکھوں
کے گوشوں میں لرز رہے تھے۔

"اٹھو — خوشی سے رخصت کرو لبنیٰ کو۔" فری نے کمال بیدردی
سے کہا۔

شبّو کے آنسو بے اختیارانہ بہہ نکلے — جنازے بھی کبھی ہنسی

خوشی رخصت کیسے جاتے ہیں — شبو کی ممتا کا بھی تو جنازہ ہی اٹھ رہا
تھا نا؟ وہ روتی کیونکر نہیں۔

"آؤ بیٹے امی سے گلے مل لو —" لبنیٰ کا ہاتھ پکڑ کر فری شبو کے
قریب لے آئی۔

شبو نے اسے سینے سے لگا لیا اور پھر اس قدر بے قراری سے
روئی۔ کہ فری کا دل بھی پسیج گیا۔ اس رقت انگیز منظر کی تاب نہ لا کر اس
نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"چلو بس بھی کرو —" کچھ لمحوں کی بے جان خاموشی کے بعد فری
نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "حوصلے سے کام لو۔"

"امی نہ رو" لبنیٰ نے ماں کا چہرہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے
صاف کیا۔ شبو نے ان ہاتھوں کو چوم لیا۔

لبنیٰ ماں کی دیوانی حرکتوں کو کیا سمجھتی۔ وہ تو ابو پاس جانے کے
لیے مچلی ہوئی تھی۔

فری نے لبنیٰ کو شبو کے بازوؤں سے اچک لیا — اس کی پیشانی
پر بوسہ دیتے وقت خود اس کا دل بھی بھر آیا — بھیگی آنکھوں سے
لبنیٰ کو دیکھا۔

ہراساں ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"چلو آؤ —" فری نے اسے گود سے اتار کر کہا۔

"امی چلو نا" اس نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔

"امی بھی آتی ہیں" فری لبنیٰ کی انگلی پکڑے باہر نکل گئی۔

!" شبو کی گھٹی ہوئی چیخ فضا کو مرتعش کر گئی۔

فری تیزی سے پورچ کی طرف بڑھی۔ جہاں ڈرائیور گاڑی لے آیا
تھا۔ اور وسیم کی ملازمہ منتظر بیٹھی تھی۔

بچی باپ سے ملی۔
پسینے کی جلن پر پانی کے ٹھنڈے ٹھنڈے چھینٹوں کا جانفزا احساس
ہوا۔

تقریباً چھ ماہ بعد وہ اپنے گھر آئی تھی۔ لیکن یہاں کی مانوس فضا میں وہ چہکنے
لگی تھی۔ وسیم بچی کے لیے کھلونے، مٹھائیاں، پھل اور کئی چیزیں اٹھا لیا۔ وہ
بہلی رہی۔

وسیم کی محبت کے لاشے میں جیسے نئی توانائی آ گئی۔ کتنا بھینچ بھینچ کر
پیار کیا اس نے لبنیٰ کو ـــ اس کی پیاری پیاری باتوں سے دُکھ کے کتنے
اندھیرے چھٹ گئے۔

سارا دن وہ لبنیٰ کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتا رہا ـــ بچی کی خوشیوں
کا ٹھکانہ نہ تھا۔

ملازمہ بھی خوش تھی۔ کہ وسیم نے جینے کا آسرا ڈھونڈ لیا۔

لیکن
شام ہوتے ہی بچی کا دل سب باتوں سے اُچاٹ ہو گیا۔ وہ ادھر
ادھر کمروں میں جیسے کوئی کھوئی ہوئی شے تلاش کرتی پھری۔
تینوں کمرے
باورچی خانہ
کوٹھڑی
غسل خانہ
اس نے سبھی دیکھ ڈالے ـــ گھوم پھر لینے کے بعد اس کی تلاش
ناکام ہو گئی۔ وسیم اپنے کمرے میں میز پر فائل کھولے بیٹھا تھا۔
ایک مدت کی بے حسی کے بعد آج پہلی بار کام میں اس کا دل لگا۔
محبت، لگن اور ہمت سے وہ لبنیٰ کے لیے کام کرنا چاہتا تھا۔
"ابو" لبنیٰ کی آواز پر اس نے گردن گھما کر دیکھا۔
لبنیٰ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں مایوسی
کے تاثرات تھے۔
"کیوں بیٹے" وہ فائل ایک طرف کر کے جلدی سے اٹھ کر اس کے
قریب آ گیا۔
"ابو ـــ لبنیٰ نے رونے کا منہ بنایا۔
"کیا ہوا ـــ میری بیٹی کو" اس نے لبنیٰ کو بانہوں میں بھر لیا۔
"امی" دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں آنکھوں پر رکھتے ہوئے وہ بسوری۔

وسیم کے دل پر گھونسا سا لگا۔

"ابو — امی کیوں نہیں آئی" چار سالہ لبنیٰ بلک اٹھی۔

وسیم ہونٹوں کے گوشے کاٹ کر رہ گیا۔ "امی کیوں نہیں آئی —
امی کیوں نہیں آئی"

اس کے دل و دماغ پر جیسے ہتھوڑے برسنے لگے — وہ بچی کو کیا جواب دیتا۔ کیسے اسے سمجھاتا۔ کہ اب امی سے ابو کا کوئی رشتہ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں — سب بندھن ٹوٹ گئے ہیں۔ وہ سب کچھ کہہ بھی دیتا۔ تو معصوم بچی اس دقیق مسئلہ کو کیونکر سمجھ لیتی۔ اس کے تعلق کی ڈوریاں تو امی ابو سے اب تک ویسے ہی بندھی تھیں نا؟

بڑی مشکل سے وسیم نے اپنے ہیجانی جذبات پر قابو پایا۔ بچی کو گود میں لیے وہ کمرے سے نکل آیا۔

"یہ بتی جلاؤ — دیکھوں بھلا تمھیں بتی جلانا آتا ہے —" وسیم بچی کا دھیان دوسری طرف منتقل کرنا چاہتا تھا۔

لبنیٰ نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبایا۔ بتی روشن ہو گئی۔

"واہ وا — ہمارا بیٹا کتنا ہوشیار ہے — آؤ دوسرے کمرے کی بتی جلائیں"

سارے گھر کی بتیاں روشن ہو گئیں — بچی کچھ لمحوں کے سبب سے بہل گئی، لیکن روح پر مسلط اندھیرے کہاں چین لینے دیتے۔

وہ

پھر

بسورنے لگی۔

"چلو بازار چلتے ہیں — کیا لو گی؟ — گڑیا — بڑی سی۔ وہ آنکھیں بند کرنے والی — اتنی بڑی — چلو — ٹافیاں بھی لے دوں گا۔

وہ اسے بازار لے گیا۔

گڑیا خریدی — ٹافیاں لیں — رنگ برنگے غبارے لیے۔ لبنیٰ بازار کی گہما گہمی سے کچھ دیر بہلی رہی لیکن جب وسیم اسے واپس گھر لے کر آیا۔ تو اس کے ہونٹوں پر امی کا لفظ ہی تھرک رہا تھا۔

ملازمہ اور وسیم کے لیے وہ آزمائش کی رات تھی۔ بڑی مشکلوں سے وسیم نے لبنیٰ کو سلایا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ پلنگ پر بچی کو سلا کر خود کرسی پر بیٹھا رہا۔

ہر گھنٹے آدھ گھنٹے بعد بچی ماں کے لیے چیخ اٹھتی — وسیم کے لیے اسے بہلانا مشکل ہو جاتا۔

سارے کمرے میں لبنیٰ کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ کہیں غبارے تھے کہیں گڑیا۔ کہیں کھلونے — ٹافیوں کے رنگین پیکٹ پلنگ کے سرہانے رکھے تھے۔ دودھ کی پیالی میز پر پڑی تھی۔

مصیبت کی رات بڑی طویل تھی۔ لیکن آخر گزر ہی گئی۔

اور

یونہی

دن گزرتے گئے۔ بچی کسی وقت کھیل میں لگ جاتی۔ کسی وقت
ماں کے لیے تڑپنے لگتی ——— وسیم کے لیے اسے روتے دیکھنا
بڑا مشکل ہوتا ——— اس کی تڑپ سے اس کا دل جل اٹھتا۔

بچی کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ لیکن اسے یقین تھا۔ کہ ایک نہ ایک
دن اس کی تڑپ ٹھنڈا لاشہ بن جائے گی۔

یہ درد وسیم کے لیے صبر آزما ضرور تھا۔

لیکن

اس نے ہمت نہیں ہاری ——— بچی کی دلجوئی کی امکان بھر کوشش
کرتا رہا ——— وہ اکثر سوچتا۔ اگر شبو مرگئی ہوتی۔ جب بھی تو بچی کو پال لیتا
——— قرار آ ہی جاتا نا لبنیٰ کو ———

کاش شبو واقعی مرگئی ہوتی۔ لبنیٰ کے ساتھ اسے بھی قرار آجاتا۔

لیکن

قرار

تو پھر اس کی تقدیر میں تھا ہی نہیں ——— چند دن لبنیٰ کے ساتھ
خوشیوں کے تعاقب میں دوڑتے اچھے گزرے۔

اس شام وہ بڑے بازار سے گزر رہا تھا۔ کپڑے کی دکانوں پہ
رنگا رنگ پرنٹ دیکھ کر اسے لبنیٰ کے لیے فراکوں کا خیال آگیا۔ یوں بھی ہر
شام اس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز لے کر جانا اس کا معمول تھا۔

کپڑے کی بڑی سی دکان کے سامنے بڑی سی موٹر کھڑی تھی۔ یہ لمبی لمبی
موٹریں دیکھ کر اس کے محسوسات بوجھل سے ہو جایا کرتے تھے۔ انھی بھاری
بھاری لمبی لمبی گاڑیوں نے تو اس کی حیات کی سیدھی سادھی راہوں کو روندا تھا۔

گھٹن کا احساس لیے وہ دکان میں داخل ہو گیا۔

بائیں ہاتھ کاؤنٹر پر پھول دار کاٹن کے تھان پڑے تھے۔

سیلزمین اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اس سے بڑھیا ساڑھیاں نکالو بھئی ——— شادی کے لیے چاہئیں
قیمت کی پروا نہیں۔ چیز عمدہ ہو ———"

کوئی بے فکرا دولت ہاتھ کے کاؤنٹر پہ جھکا تھا۔

وسیم نے گردن گھما کر دیکھا۔

اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

اک لمحہ کو اسے یوں لگا جیسے وہ عالمِ نزع میں ہو۔

اس کے ماتھے پہ پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔

رنگ برنگی ساڑھیاں کاؤنٹر پہ پھیلی تھیں۔ بھاری بھرکم مرد اور قیمتی
ساڑھیاں دکھانے کو کہہ رہا تھا۔

اور

شبو

ہاں وہ شبو ہی تو تھی۔

سبز پلے دار ساڑھی میں ملبوس وہ گہرے سوٹ والے بھاری بھرکم

مرد کے شانہ بشانہ کھڑی ساڑھیاں پسند کر رہی تھی۔

وسیم اسے اک غیر مرد کے ساتھ برداشت نہ کر سکا۔

"کونسا رنگ پسند آیا جناب؟" سیل مین نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ وسیم جواب دیے بغیر مڑا۔

اور

تیزی سے دکان سے باہر نکل گیا۔

سیل مین نے طنزیہ استحقار سے اسے دیکھا۔ اور کھلے تھان سمیٹنے لگا۔ اس رات گھائل کی تڑپ دید کے قابل تھی۔ اس مرد کے الفاظ کی کانوں میں بازگشت پریشان تر کر رہی تھی۔

شادی کے لیے ساڑھیاں!!!

تو کیا؟ —— کیا؟

شبو شادی کر رہی تھی۔

کتنا جان لیوا تھا۔

ایک غیر مرد کے ساتھ دیکھ کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ جیسے وہ اب بھی اس کی بیوی ہو —— اور غیر مردوں کے ساتھ اس کا میل جول اس کی غیرت پر چھری پھیر رہا ہو۔

دکھ کا یہ احساس اس نے اس حقیقت سے مٹانا چاہا۔ کہ وہ شبو کو طلاق دے چکا ہے۔

طلاق!

جس سے اس کا شبو سے روحانی، ذہنی، جسمانی ہر رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ وہ شادی کر رہی ہے۔ تو یہ ہونا ہی تھا۔ طلاق اس نے دی ہی اسی لیے تھی۔

لیکن

سارے دلائل حقیقت پر مبنی سہی۔ یہ دکھ کے احساس کو اس کے ذہن سے جدا نہ کر سکے۔

رات اس نے تڑپ تڑپ کر کاٹی۔ آج لبنیٰ کے ساتھ وہ بھی تڑپ رہا تھا۔ لبنیٰ کی آنکھیں رو رہی تھیں۔ تو اس کا دل رو رہا تھا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے ملازمہ سے کہا —— "میں تبدیلی کروا رہا ہوں۔ دوسرے شہر میرے ساتھ چلوگی؟"

"تبدیلی کیوں کروا رہے ہو؟" ملازمہ نے سادگی سے پوچھا۔

"یہ نہ پوچھو" وہ چڑ کر بولا "یہ بتاؤ۔ میرے ساتھ چلی جاؤ گی؟"

"چلی جاؤں گی ——"

"بس ٹھیک ہے ——"

اور اس نے اسی دن تبادلے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ اس شہر سے وہ دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ یہاں تو آگ ہی آگ تھی ☆

تبادلے کی کوشش بارآور ہوئی۔ احکامات آنے کی دیر تھی بس
وسیم دوسرے شہر جانے سے بڑا مطمئن تھا۔

لیکن

تقدیر نے تو اسے تاک تاک کر نشانہ بنانے کی جیسے قسم کھا رکھی
تھی۔ جن شعلوں سے وہ دور بھاگنا چاہتا تھا وہی لپک لپک کر اس کا دامن
پکڑ رہے تھے۔

چھٹی کا دن تھا۔ وسیم ناشتہ کر کے لبنیٰ سے کچھ دیر کھیلنے کے
بعد اخبار لے کر بیٹھ گیا۔

بچی صحن میں کھیلنے کے لیے اپنے سارے کھلونے اور گڑیاں
لے گئی۔

ملازمہ باورچی خانے کا کام ختم کر کے صحن میں لبنیٰ کے پاس ہی
آ بیٹھی۔

ساتھ والی ہمسائی اکثر ملازمہ کے پاس آ بیٹھا کرتی تھی۔ آج بھی ادھر
آ نکلی ——

"اے بہن کچھ سنا تم نے —— وہ ڈیوڑھی ہی سے بولی۔ وسیم
بھی اس کی آواز پر متوجہ ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" ملازمہ نے پوچھا۔

"آج شادی ہے" وہ جیسے کوئی راز افشا کرتے ہوئے مسکرائی۔

"کس کی؟" ملازمہ نے پوچھا۔

"اس کی ماں کی" اس نے لبنیٰ کی طرف اشارہ کیا۔ جو گڑیوں کا گھر
سجانے میں مصروف تھی۔

ملازمہ نے سہم کر اسے دیکھا —" کیا؟ —— سچ ——!"

"اللہ قسم آج ہی میری بہو نے بتایا ہے۔ اس کی بہن بھی اسی طرف
رہتی ہے —— آج شام نکاح ہو رہا ہے —— سنا ہے۔ کوئی بڑی مالدار
اسامی ماری ہے ——"

وسیم نے نادانستگی میں ادھر توجہ دی تھی۔ اسے پتہ ہوتا کہ ہمسائی
ایسا جان لیوا انکشاف کرے گی تو شاید وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس
لیتا ——

ہمسائی ملازمہ سے تفصیلاً گفت و گو کر رہی تھی —— لیکن وسیم میں
کچھ اور سننے کی تاب ہی کہاں تھی۔

اخبار ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ اور وہ بے جان نعش کی طرح کرسی پہ

پڑا رہا۔

وہ رات ——— وسیم کے لیے قبر کی عذاب رات سے بھی بدتر تھی

آج لبنیٰ بھی معمول سے کچھ زیادہ ہی ماں کے لیے مچلی تھی۔ وہ تو کچھ دیر بعد سو
کر سکون پذیر ہو گئی۔

لیکن

وسیم اس رات پل بھر نہ سو سکا۔ رات کا ایک ایک لمحہ اس کے
سینے پہ ڈنک مارتا ہوا رینگ رہا تھا۔

آج شبو کی شادی تھی ——— اس کی سہاگ رات تھی۔

اُف! یہ تصور بھی اس کی برداشت سے باہر تھا۔ لیکن کیسا سخت جان
ہے انسان، نہ برداشت کرنے والی باتیں بھی کس طرح برداشت کیے جاتا ہے

"شبو!"

"شبو!"

وہ دیوانوں کی طرح چیخنا چاہتا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس پلنگ
کو دیکھ رہا تھا۔ جس پر آج سے پانچ سال پہلے شبو سمٹی سمٹائی حیا کا پیکر بنی سرخ
سرخ ساٹن کے گوٹے کی ٹکلیوں والا سوٹ پہنے بیٹھی تھی۔

آج

وہ کسی اور کے پہلو میں گر گئی۔

وہ عالمِ اضطراب میں کمرے میں پھر رہا تھا۔ سر جھٹک رہا تھا۔ ہونٹوں
کے گوشے کاٹ رہا تھا ——— اس کے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ جانے

یہ محبت جل رہی تھی۔ یا انتقام بھڑک رہا تھا۔ وہ بے چین تھا۔ بے قرار تھا۔
شاید ——— شاید اس لیے کہ شبو اب بھی دل کے کسی ویران گوشے میں کسک
بن کے بیٹھی تھی۔ شعوری طور پہ وہ اس بات کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھا۔ لیکن
حقیقت کو جھٹلانا بھی تو اس کے بس میں نہیں تھا۔

لبنیٰ اس کے پلنگ پہ بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ کتنا ترس آیا اسے
اس معصوم سی جان پہ ——— اتنی سی عمر میں اتنے دکھ جھیل ڈالے اس نے
——— ماں کی ممتا سے ماں کے جیتے جی محروم ہو گئی بدنصیب بچی ———

وہ پلنگ کے قریب آ کر بچی پہ جھک گیا ———

"مجھے تو اس نے اس لیے چھوڑ دیا۔ کہ میں اس کی اونچی اڑان کے
لیے بال و پر نہ رکھتا تھا۔ لیکن لبنیٰ! ——— اس نے تمہیں کس تصور کی سزا دی
ہے ——— ممتا کے حیات بخش اجالوں کی جگہ اس نے تمہیں ——— اندھیرے
ہی اندھیرے دے دیئے ——— تم ماں ماں پکارتی ہو ——— لیکن آج۔
ممتا کے لاشے نے سونے چاندی کی سلوں تلے دب کر آخری
ہچکی بھی لے لی۔ تمہیں ماں نہیں ملے گی میری بچی ——— کوئی ممتا بھرا ہاتھ شفقتوں
کے پھول تمہارے اوپر نچھاور نہیں کرے گا ——— تم روؤ گی ——— تڑپو گی ———
لیکن اسے نہیں پا سکو گی ——— وہ میری اور تمہاری دسترس سے دُور ہو چکی ہے،
آج وہ ——— کسی سیٹھ کے پہلو میں جا بیٹھی ہے۔ ہم غریبوں سے اس کا کیا
واسطہ ———"

نواز نے کروٹ بدلی۔
نرم ربڑ کے گدے والا اسپرنگ دار پلنگ دب کر ابھرا مدھم سی چرچراہٹ
ہوئی۔
اور
شبو کی آنکھ کھل گئی۔
نقرئی اجالے پردوں کی درزوں میں سے اندر جھانک رہے تھے۔
آراستہ سی خواب گاہ میں خواب ناک میں روشنی ہو رہی تھی۔ ملگجے اجالوں میں
آراستہ سی خواب گاہ کا حسن بڑا رومانوی لگ رہا تھا۔
شبو نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر دیکھا۔ چند لمحے تو اسے بالکل
پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے؟
کمرے میں خوابوں کا حسن بکھرا ہوا تھا۔ جھلملاتے ریشمی پردے۔
فرش کے سینے سے چپٹا ہوا قالین ——— سپرنگ دار پلنگ ——— خوبصورت

گلدان۔ شاندار مجسمے۔
اس نے آنکھیں جھپکا کر پھر چاروں طرف دیکھا۔
نیند کی دھند شعور سے چھٹی ——— اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے
کر دیکھا۔
مخمل کے گرم نرم تکیوں پر سر رکھے نواز بے ترتیبی سے سو رہا تھا۔
نواز
اس کا نیا شوہر نواز
نیا شوہر
اک چیخ اس کے حلق سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔
اس کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔
گھبرا کر اس نے منہ پھیر لیا۔ آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ اس کا دم
گھٹنے لگا۔ گزری ہوئی رات کا اک اک لمحہ اس کے ذہن میں رینگنے لگا۔
گھبرا کر وہ اٹھی۔ چھپی چھپی نظریں اس نے پہلو میں سوئے ہوئے نواز
پر ڈالیں۔
وہ اس کا شوہر تھا۔
نہیں۔ نہیں ——— نہیں ——— اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر اس حقیقت
سے انکار کرے۔
لیکن
ذہن میں رینگتے ہوئے متلاطم لمحے مظہر تھے کہ وہ رات اس کے پہلو

میں بیوی بن کر گزار چکی ہے۔

دُکھ اور کراہت کے ملے جُلے جذبات نے اسے بے چین کر دیا۔ اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ ایک تشنجی سی کیفیت سارے وجود پہ طاری ہونے لگی۔

اس کا ضمیر نواز کو شوہر تسلیم کرنے پہ آمادہ نہ تھا۔ اسے یُوں لگ رہا تھا۔ جیسے رات اس نے قانونی، مذہبی اور اخلاقی حد بندیاں توڑ کر کسی غیر شخص کے پہلو میں گزاری ہو۔

مجرمانہ کیفیت اس پہ حاوی ہوتی گئی۔

اسے یُوں لگا۔ جیسے وہ عورت نہیں طوائف ہے۔

طوائف۔

طوائف۔

طوائف ——— جو عزت ——— غیرت اور محبت سونے چاندی کے روپہلی سکوں کے عوض نیلام کر دیتی ہے۔

اس نے ——— وسیم کی سفید پوشی بر سرِ عام نیلام کر دی تھی۔

دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے وہ پلنگ پہ بیٹھی تھی۔ ذہن میں شور اٹھ رہا تھا۔ ضمیر تڑپ رہا تھا۔

وہ نواز کو شوہر تسلیم نہ کر سکی۔ ضمیر نے اس حقیقت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ ضمیر کی حقیقت پسندی نے مجرمانہ کیفیت کو تقویت دی اور وہ اپنے آپ کو عورت نہیں طوائف سمجھنے لگی۔

اس کا دل بے طرح گھبرانے لگا۔

دھیرے سے سر اٹھا کر اس نے چھپی چھپی نظروں سے نواز کی طرف دیکھا۔

وہ دیکھتی رہی۔

اس کے ذہن میں وسیم کا عکس لہرانے لگا۔

موٹے موٹے بھدے ہونٹوں والا نواز وسیم سے کیا مناسبت رکھتا تھا؟

اسے وسیم کے سونے کا انداز یاد آ گیا۔

کتنا مسحور کن ہوتا تھا۔ اس کے سونے کا انداز ——— پُرسکون ——— مطمئن، جیسے فرشتوں کے دامن تلے ——— حوروں کی مقدس لوریاں سنتے ہوئے کوئی معصوم روح مدہوش ہو گئی ہو۔

لیکن

نواز

اُف ——— وہ سونے میں اس کے مکروہ انداز کو برداشت نہ کر سکی۔

وہ پلنگ سے اُتر گئی۔

اس کی نظر اپنے شب خوابی کے ہلکے گلابی لباس پہ پڑی ——— ریشمی لباس ——— نرم و ملائم لباس ———

پھر اس کی نظر کرسی پہ پھیلے ہوئے نائٹ گاؤن پہ پڑی۔ ریشمی ڈوریوں
والا گاؤن۔ وہ بڑھی — گاؤن ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔
تمول کی یہی چیزیں تھیں — جنھوں نے اس کے سینے سے وفاداری
اور تمنا دونوں کو نوچ پھینکا تھا۔
کئی لمحے وہ گاؤن کو دیکھتی رہی۔ پھر کندھوں پر ڈال لیا۔

اور
نفیس سی سنگار میز کے ملبوترے آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔
اس نے غور سے اپنا سراپا دیکھا۔
سب کچھ بدل چکا تھا۔
اس نے بال ترشوا لیے تھے۔
اس کے جسم پہ کاٹن کے سلوٹ زدہ کپڑے نہیں تھے۔
اس کے ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں بھی نہ تھیں۔
کاٹن کے سلوٹ زدہ کپڑوں کی جگہ ملائم ملائم سے ریشمی کپڑے
تھے۔ اور کانچ کی سرخ چوڑیوں کی بجائے کلائیوں میں سونے کی ڈھیر سی
چوڑیاں تھیں۔
وہ پاگلوں کی طرح ان چیزوں کو دیکھنے لگی۔
اس نے پھر آئینے پر نظر ڈالی۔
واقعی سب کچھ بدل چکا تھا۔
لیکن

لیکن اس کی آنکھیں وہی تھیں — وہی تھیں — غور سے اپنی
آنکھوں میں جھانکا — ماضی کے اندھیروں میں کئی لاشے سے نظر آئے
گھبرا کر اس نے آئینے سے نظر ہٹانا چاہی۔

لیکن

ایسا نہ کر سکی۔
وہ اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی — ان آنکھوں
میں اسے اس شبو کا عکس نظر آ رہا تھا۔

جو
وسیم کی بیوی تھی۔

اور

جو
ببنی کی ماں تھی۔
معاً ان آنکھوں سے طنز کے شرارے پھوٹنے لگے — یوں لگتا
تھا جیسے کہہ رہی ہوں۔
”پا لیا — جس کی تمنا تھی — سب کچھ مل گیا تجھے — کوٹھی۔
موٹر — زیور — کپڑے — دولت — سب کچھ مل گیا —
شوہر بھی مل گیا — بچے بھی ہو جائیں گے — لیکن — ان سب
چیزوں کو پا لینے کے باوجود تو سکون سے دور رہے گی — تجھے قرار
نہیں ملے گا — تیرا احساس تجھے ہر وقت ڈستا رہے گا —

کیونکہ تو ناصب ہے — تو نے وسیم کی محبت کو غصب کر لیا۔ تو نے ممتا کو نوچ ڈالا — تو محبت کی قاتل ہے۔ تو ممتا کی چور ہے — تو مجرم ہے — مجرم ہے — مجرم —!

اس کے ذہن میں شور مچ گیا۔

آنکھیں گھورتی رہیں۔

گھورتی رہیں۔

"تڑاخ!" اس نے بڑا سا گلدان اٹھایا — اور پورے زور سے آئینے پر دے مارا۔

شیشے کے ٹکڑے ایک چھناکے سے گرے۔

نواز ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

گھبرا کر اس نے شبو کی طرف دیکھا۔ جو سنگار میز کے ٹوٹے آئینے کے سامنے سٹول پر سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا؟" گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھا۔

شبو اسی طرح بیٹھی رہی۔

"شبو —" پلنگ سے اترتے ہوئے اس نے پکارا۔

وہ ہلی تک نہیں۔

"شبو — اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔ "کیا ہوا؟"

"شیشہ ٹوٹ گیا —" وہ جیسے تہہ سے بولی۔

"اوہو —" وہ ہنسا۔ "تم نے توڑا ہی دیا۔"

"میں نے — میں نے توڑا ہے۔"

"تو کیا ہوا" وہ اس کی سراسیمگی پر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا — "اور آجائے گا۔"

"اور آجائے گا —" وہ بڑبڑائی۔

"ہاں ہاں — گھبرانے کی کیا بات ہے — آجائے گا بھئی — آج ہی آجائے گا۔"

"اور آجائے گا — لیکن — لیکن — یہ جُڑ تو نہ سکے گا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

نواز اس کی ذہنی کیفیت سے بے خبر تھا۔

بالکل۔

بے خبر۔

شبو کئی دن تک نہ سنبھل سکی۔

کبھی تو وہ اچھی بھلی ہو جاتی ــــ ہنستی مسکراتی۔

لیکن

کبھی اس پر دورہ سا پڑ جاتا۔ وہ مجنونانہ حرکتیں کرنے لگتی۔ سپرنگ دار
پلنگ کے نوم ربڑ والے گدے پر لیٹ کر کروٹیں بدلتی۔ لوچ دار سی مترنم
چرچراہٹ پر وہ مسکرا مسکرا اٹھتی ــــ سنبل کے ریشمی تکیوں میں منہ
چھپا چھپا لیتی۔

الماری سے ساری ساڑھیاں ــــ سوٹ ــــ لہنگے نکال کر
اپنے اوپر لاد لیتی۔

سیف کھول کر زیور الٹا سیدھا پہننے لگتی۔ اور جب پہننے کی گنجائش
نہ رہتی۔ تو زیور کے ڈبے جھولی میں بھر لیتی۔

پھر

پھر وہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگتی۔

قہقہے بلند اور بے ہنگم ہوتے جاتے۔ اس پر بے خودی طاری
ہو جاتی۔ اس پر تشنج سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ مٹھیاں بھنچ جاتیں، دانت بند
ہو جاتے۔ ماتھے پر پسینہ آ جاتا۔

اور

وہ بڑی بڑی دیر بے ہوش پڑی رہتی۔

نئی نویلی بیوی کی عجیب و غریب بیماری سے نواز بڑا پریشان ہوا۔
کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔ تقریباً سبھی نے ہسٹریا تشخیص کیا۔

"انھیں زیادہ سے زیادہ مصروف رکھیں۔ سوچ میں ڈوبنے کا موقع
ہی نہ دیں ــــ تشویش کی کوئی بات نہیں ــــ دوائی سے زیادہ انھیں
بہلائے رکھنے کی ضرورت ہے ــــ"

اور نواز نے اسے بہلانے کے کئی نسخے آزما ڈالے۔ تفریحی پروگرام
بھی شبو کو راس نہ آئے تو نواز اسے دو ہفتے کے لیے باہر لے گیا ہفتہ بھر
شبو خوش و خرم رہی۔

سارا سارا دن گھومتی پھرتی رہتی ــــ نئی نئی چیزیں خریدتی، نئے
نئے لوگوں سے ملتی۔ یوں بھی دل کو سمجھانے کا شعور آ گیا تھا ــــ جو پایا تھا
اسے گنوانا بھی نہ چاہتی تھی ــــ بہت کچھ سنبھلی ــــ بیتی باتوں پر مٹی
ڈال دینے کا عزم کرکے مطمئن ہونا چاہتی تھی نا۔

لیکن ان ساری کاوشوں کے باوجود وہ نواز سے کوئی روحانی یا ذہنی

گوارا نہ کر سکی۔ اس کے ساتھ تنہائی کا ہر لمحہ گزارنے پر ضمیر میں چبھن ہوتی۔ وہ ساتھ نباہنے کو اس سے ہنس بول بھی لیتی۔ اس کے بازوؤں میں مچل بھی جاتی اس کے ساتھ راتیں بھی گزار لیتی۔ لیکن کراہت کا احساس ذہن میں بدستور جاگزیں تھا۔

اس کی قربت میں خوشی، اطمینان اور آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی ہمیشہ اس نے گھٹن ہی محسوس کی —— اس کے پیار کے انداز میں کاروبار کی سی لوٹ کھسوٹ کا احساس ہوا۔

کتنا مدھر —— کتنا فرحت بخش ہوتا تھا وسیم کے پیار کا انداز ——
وہ جب اسے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیتا تو اس پر کیف زا سی غنودگی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ اندازِ سپردگی سے وہ کچھ اور سمٹ جایا کرتی تھی۔ اس کی چوڑی چھاتی سے یوں لگ جایا کرتی تھی۔ جیسے اس کے سینے کی گہرائیوں میں اتر جانے کو مچل رہی ہو۔

نواز کے ساتھ اس نے یہ آٹھ دن بمشکل گزارے —— چوبیس گھنٹے کی رفاقت سے راس بھی کیونکر آتی۔

"واپس گھر چلیئے!" اس نے بیزاری سے نواز کو کہا۔

"کیوں —— ابھی تو آٹھ دن ہی ہوئے ہیں —— ہمارا پروگرام پندرہ دن کا ہے۔"

آپ کے کاروبار کا بھی ہرج ہوتا ہو گا —— "اس نے بہانہ بنانا چاہا۔

"اس کی پروا نہ کرو —— منیجر ہے وہاں —— پرسکون —— یہ

تنہائیاں وہاں کہاں میسر آئیں گی —— تم بھی تو خاصی اچھی ہو گئی ہو یہاں آ کر۔"

"اسی لیے تو واپس جانا چاہتی ہوں —— اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
وہ دانستہ مسکرائی۔

"دل خوش کر دیا بیگم ——" چلو تیار ہو جاؤ بازار چلیں —— دیکھو اس خوشی کا صلہ تمھیں کتنا دیتا ہوں۔ شکر ہے۔ آج تمھارے ہونٹوں پر اپنے آپ مسکراہٹ آ گئی۔"

شبو پر اس کی چاپلوسی کا اثر کیا ہوتا —— نواز نے ساتھ چلنے کو بہتیرا کہا۔ لیکن وہ تیار نہ ہوئی۔

نواز اکیلا ہی چلا گیا۔

اور

جب شام کو وہ واپس آیا۔ تو اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت پیکٹ تھا۔

"یہ کیا ہے ——؟"

"آج خوشی کرنے کا صلہ۔"

"جی!"

"کھول کر دیکھو۔"

"ساڑھی ہو گی۔"

"لیکن اتنی نفیس —— کہ بس طبیعت مچل جائے —— ابھی پہن کر دکھاؤ۔ چاند نظر آؤ گی۔ چاند —— اس نے شبو کی ٹھوڑی کو چھوا۔

"یہاں نظر آؤ گی چاند —" شبو کے کانوں میں دھیمے دھیمے الفاظ گونجنے لگے۔ وہ کھو سی گئی۔

"کھول کر دیکھو — تو بیگم — کیا لاجواب چیز لایا ہوں۔"

شبو نے سر جھٹک کر ذہنی کچوکوں سے نجات پانے کی کوشش کی —

نواز نے میز پر رکھا ہوا پیکیٹ اٹھا کر کھولا —

اس نے آسمانی رنگ کی چوڑے پلے والی ساڑھی پھیلا کر شبو کی طرف داد طلب نظروں سے مسکرا کر دیکھا۔

آسمانی ساڑھی — شبو نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کانوں میں دھیمے دھیمے الفاظ کی گونج تیز ہو گئی۔

"پسند نہیں آئی —" نواز پلنگ پر بیٹھی ہوئی شبو کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا —

دونوں ہاتھوں پر پھیلی ہوئی ساڑھی اس نے شبو کے اوپر ڈال دی

"کتنا دیدہ زیب رنگ ہے۔ پہن کر دکھاؤ نا! — چاند نظر آؤ گی —"

"چاند — چاند — چاند —" شبو چیخی — دیوانوں کی طرح ساڑھی کو پکڑ کر نوچا — اور پھر پاگلوں کی طرح گول مول لپیٹ کر ساڑھی کمرے کی دیوار سے دے ماری۔

نواز حواس باختہ سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

شبو تکیے پر گر گئی۔

وہ ہانپ رہی تھی۔

نواز کچھ نہیں بولا۔ ہاں آج اس کی اس حرکت پر اسے دلی ملال ہوا۔ ہمدردی جتلانے کی بجائے وہ کچھ برافروختہ سا ہو گیا۔

رات اس نے شبو سے بات تک نہ کی۔

صبح اٹھا۔ تب بھی اس کا موڈ خراب تھا۔

"تیاری کر لو — آج ہمیں واپس جانا ہے۔" اس نے سرد اور خشک لہجے میں شبو سے کہا۔

شبو کچھ ایسی ناسمجھ تو تھی نہیں — نواز کے تیور کسی خوش گوار علامت کی نشان دہی تو نہ تھے۔ اس نے ٹھنڈے دل سے سوچا — سب کچھ پا کر کھو دینا کہاں کی عقل مندی تھی۔ اب جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اس طرح کی جذباتی لغزشیں تو اسے کہیں کا نہ رکھیں گی —

اس نے ماضی کو یکسر بھول جانے کا عزم بھی اک لمحہ میں کر لیا۔

نواز اسے تیاری کا کہہ کر خود بھی کپڑے بدلنے چلا گیا۔

شبو پوری ہوش اور سوچ سے کام لے رہی تھی — نواز تیار ہو کر آیا۔ سگار سلگا کر وہ بے تعلقی سے کھڑا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

شبو اٹھی — دھیرے سے بڑھی — اور نواز کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

نواز نے مڑ کر دیکھا۔

وہ مسکرا دی۔

"کیوں؟"

"آپ کچھ ناراض ہو گئے ہیں؟"

"ناراض تو نہیں ـــــ البتہ یہ افسوس ضرور ہے کہ ہماری شادی اک غلطی ہے ـــــ"

شبو سہم گئی ـــــ سر جھکا کر وہ دونوں ہاتھ ملنے لگی۔

"میرا خیال درست ہے نا؟" اس نے شبو سے پوچھا۔

"نہیں ـــــ" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"سچ کہتی ہو؟" اس نے شبو کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر پوچھا۔

"جی" شبو نے جواب دیا۔

گو اس کے اقرار میں کوئی جوش کوئی والہانہ پن نہیں تھا۔ پھر بھی اقرار تو تھا۔ نواز خوش ہو گیا۔ اس خوشی کا اظہار بھرپور پیار تھا۔ شبو دل پر پتھر کی سل رکھ کر اس کے پیار کے وار سہتی رہی۔

شبو نے عہد کر لیا۔ کہ اب وہ سینے میں ٹکرانے والے طوفانوں کو نکلنے کی کبھی راہ نہ دے گی ـــــ سب کو سینے کے اندر ہی سمیٹ لیا کرے گی۔ اب جو قدم اٹھا چکی تھی۔ وہ واپس تو پلٹنے سے رہا۔ پھر زندگی کو اپنے جذباتی پن سے تلخ بنانے کا فائدہ ہی کیا۔

اس عہد پر کاربند ہو کر وہ خاصی کامیاب رہی ـــــ پندرہ دن باہر گزار کر وہ گھر واپس جانے سے پہلے فری سے بھی ملتی آئی ـــــ ظاہرداری کا لبادہ کچھ اس مضبوطی سے بنا ہوا تھا کہ فری کو گمان تک نہ گزرا۔ کہ شبو اپنے حال سے زبردستی لپٹی جا رہی ہے۔

زندگی کی گاڑی وقت کے پہیوں پر دوڑتی چلی جاتی ہے ـــــ رنگا رنگ مناظر آتے ہیں۔ اور گزر جاتے ہیں۔ طوفان اٹھیں۔ ہنگامے ہوں ـــــ یہ گاڑی دوڑتی چلی جاتی ہے۔

وقت رکتا ہے۔ نہ زندگی ٹھہرتی ہے۔

شبو کی زندگی بھی گزر رہی تھی۔ حالات سے مصالحت کر کے اپنی زندگی پر سکون کا ملمع کچھ زیادہ ہی چڑھا لیا تھا۔ سیر و تفریح سے واپس آ کر وہ بڑے مطمئن انداز میں اپنے شاندار گھر کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔ ملازموں سے بھی خوب کام لینے لگی۔ جو سارا دن بیکار بیٹھے اونگھا ہی کرتے تھے۔ لیکن شبو اب ان کے پیچھے پڑ گئی ـــــ ذہن کو مصروف رکھنے کا یہ بڑا مجرب طریقہ تھا نا؟

اس دن موسم بڑا خوشگوار تھا۔ شبو سامنے والے خوبصورت چمن میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ ہلکے زرد رنگ کا لباس اس کے دلکش جسم پر خوب اٹھ

رہا تھا۔ نوکروں کو کام سونپ کر وہ باہر آ بیٹھی تھی۔

"فیقنو!" اس نے مالی کو پکارا۔

"جی بیگم صاحب" وہ مؤدبانہ آ کر بولا۔

اس کے لہجے میں شبّو کے کسی پیاسے جذبے کی تسکین ہو گئی۔

"رانی آئی ہو تو کہو میرے لیے چائے بنا لائے"

"بہت اچھا حضور ۔۔۔"

مالی چلا گیا۔ شبّو خلاؤں میں گھورنے لگی۔

کچھ دیر بعد مالی واپس آ گیا ۔۔۔ "بیگم صاحب! آج رانی کام پر نہیں آئی ۔۔۔ صدیق کو چائے کا کہہ آیا ہوں"

"رانی کیوں نہیں آئی"

"پتہ نہیں" مالی چلا گیا۔

شبّو کو رانی پر بے طرح غصہ آ گیا۔ وہ بغیر اطلاع دیئے غائب ہو گئی اسے پتہ نہیں تھا۔ کہ وہ شبّو کی خاص ملازمہ ہے۔ اسے شبّو کے لیے چائے بنانا ہے۔ اس کا کمرہ ٹھیک کرنا ہے۔ اس کے کپڑے استری کرنے ہیں ۔۔۔

یہ سارے کام وہ خود بھی کر سکتی تھی۔ لیکن انا کی تسکین کے لیے آج کل اس نے بڑے کھوکھلے ڈھونگ رچا رکھے تھے۔ وہ کوئی کام خود نہ کرتی۔ ہر کام ملازموں سے لیتی ۔۔۔ ایسی باتوں ہی کے لیے تو اس نے کسی کی جیتی جاگتی خواہشات کا گلا گھونٹا تھا۔ یہی کام کرنا تھا تو پھر اس

زندگی میں کیا عیب تھے۔ جسے اس نے روند ڈالا تھا۔

انتقاماً وہ کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھی۔ یہ انتقام وہ کس سے لے رہی تھی۔ اس کا تجزیہ وہ خود بھی نہ کر پاتی۔

شاید

شاید یہ انتقام ان جذبوں سے تھا۔ جو وسیم کے خلاف ابھرے تھے اور جنھوں نے ممتا کا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب ملازمہ آ گئی۔ بیگم کو چمن میں دیکھ کر وہ سہمی سہمی ادھر ہی آ گئی۔

"بیگم صاحب" اس نے آہستگی سے پکارا۔

"کون" شبّو نے گردن موڑ کر پوچھا۔

"میں بیگم صاحب" ملازمہ اس کے سامنے آ گئی۔

"اس وقت آئی ہو ۔۔۔ کہاں تھی اب تک" شبّو کا پارہ چڑھ گیا۔

"بچی بیمار ہے بیگم صاحب ۔۔۔"

"بچی بیمار ہے تو میں کیا کروں"

"بڑا تیز بخار ہے اسے بیگم صاحب ۔۔۔ بڑی مشکلوں سے سُلا کر آئی ہوں"

"تیز بخار ہے تو میں کیا کروں" وہ غرائی۔

"دو دن کی چھٹی دے دیں بیگم صاحب" اسے کوئی دوا دارو لا کر دونگی" وہ لجاجت سے کہہ رہی تھی۔ شبّو کو غصہ پہلے ہی آ رہا تھا۔ ملازمہ کے

بچی کے لیے یوں بلکنے پر تو اس کا غصہ غضب بن گیا۔

"بخار اُتر گیا تو حاضر ہو جاؤں گی بیگم صاحب — میری بچی بخار سے تپ رہی ہے۔"

ممتا کا سمندر موجزن تھا ملازمہ کے چہرے پر — اس کے چہرے کے تاثرات سینے میں محبت کے اُمڈتے طوفانوں کے مظہر تھے۔ بچی کے لیے وہ کتنی متفکر تھی۔ جیسے اس کی کائنات ہی ڈول گئی ہو۔

اسے دیکھ دیکھ کر شبّو کو جانے کیا ہونے لگا۔ رحم آنے کی بجائے خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ہمدردی کی جگہ نفرت کا ریلا آیا۔ اس کا جی چاہا۔ ملازمہ کا منہ نوچ لے۔

ملازمہ کا منہ

جس پر ممتا کے سمندر موجزن تھے۔

"کوئی چھٹی نہیں ملے گی۔" ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ غرّائی۔

"بیگم صاحب!— نوکرانی بیچارگی سے بولی۔

"کہہ دیا نا۔ کوئی چھٹی نہیں ملے گی —" شبّو چیخی۔

"میری بچی بیمار ہے بیگم صاحب —!"

"بکو مت — چل کر کام کرو — میرے لیے چائے بنا کر لاؤ — میرا کمرہ صاف کرو — میرے سارے کپڑے نکال کر استری کرو — جاؤ —!" وہ پاگلوں کی طرح حکم دیئے گئی۔

نوکرانی نے اسے ششدر سی نظروں سے دیکھا —"بیگم صاحب

میری بیٹی اچھی ہو گئی۔ تو سارا کام کر دوں گی ہے بیگم صاحب —!"

نوکرانی کا ممتا بھرا دل چھلک گیا۔ میلے در ہوئے اس نے ہاتھ باندھ دیئے۔

"آپ ماں کے دل کو نہیں سمجھتیں بیگم صاحب۔

"رانی —!" وہ گرجی۔

رانی سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"جا کر کام کرو۔ ورنہ نوکری سے برطرف کر دوں گی — سمجھیں

وہ اٹھ کر رانی کے پاس آ کر چیخیں —" نوکری سے جواب مل گیا تو پیسے کہاں سے لوگی — پیسے — پیسہ ضروری ہے یا بچی — پیسہ — پیسہ —" شبّو کہتی گئی۔

نوکرانی نے سہم کر مالکہ کو دیکھا۔ کتنی خوفناک نظر آ رہی تھی وہ — رنگ فق تھا — آنکھیں انگارہ تھیں اور سارا جسم لرز رہا تھا۔

رانی نے رو رو کر اس سے رحم کی بھیک مانگی۔ اور جب اس نے ممتا کا واسطہ دیا تو شبّو نے جھپٹ کر اس کے بال پکڑ لیے —" کام کرو ورنہ نوکری سے جواب دے دوں گی — جواب — سمجھی —"

ملازمہ کی ممتا بھڑک اٹھی — غیرت جوش میں آ گئی — بال چھڑاتے ہوئے وہ تیزی سے بولی "دے دیجئے جواب — مجھے نہیں چاہیئے پیسہ — میری بچی بیمار ہے۔ میں اس پہ جان بھی قربان کر سکتی ہوں —

بچی کے لیے یوں بلکنے پر تو اس کی بنے گی — تو اور ڈھونڈھ لوں گی — اسے

"تمہارا نہ گیا تو جانے ہے — میں کیا کروں گی —" وہ رو پڑی۔

تپ رہی ہے۔" ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

ممتا کا سمندر مونے غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

کے تاثرات سینے ن

لیے وہ کتنی متفکر تو وہ ٹھٹک گئی۔ مشتو کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

اسے "تو ماں ہے — اور — میں — میں — شبو پھوٹ

خونخوار پھوٹ کر رونے لگی۔

روتے روتے اس پر وہی تشنجی کیفیت طاری ہو گئی۔

مٹھیاں بھنچ گئیں۔ دانت بند ہو گئے — اور وہ بستر پر

کر گر پڑی ۔

"مجھے تو اس کی بیماری کی کچھ سمجھ نہیں آتی — بیٹھے بیٹھے طبیعت ایسی بیزار ہوتی ہے کہ بس — کچھ دن اچھی بھلی رہے گی۔ پھر دورہ آن پڑتا ہے۔ دورہ تو ختم ہو جاتا ہے لیکن طبیعت دنوں نہیں بہلتی۔ دیکھ لیں پچھلے ہفتے دورہ ہوا تھا۔ اب تک مزاج درست نہیں۔"

نواز نے فری سے گلہ آمیز باتیں کیں۔ فری شبو سے ملنے آئی تھی۔ وہ تو بڑی مسرور تھی۔ کہ شبو کو نئی زندگی راس آگئی ہے۔ لیکن یہاں آکر حقیقت سے آگہی ہوئی۔ تو وہ پریشان سی ہو گئی۔ نواز کی باتوں میں خطرے کی گھنٹی محسوس ہوئی۔

"مجھے تو اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ شادی شبو کی رضا سے نہیں ہوئی —"

"جی نہیں" — فری جلدی سے بولی — "وہ کوئی بچہ تو نہ تھی۔ اور پھر آج کے دور میں کسی کو مجبور بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"شبو بھی یہی کہتی ہے۔" نواز گہری سانس لے کر بولا۔

"پھر آپ کو یقین ہو جانا چاہیے نواز بھائی — فری نے ہنس کر سنجیدہ سی گفت وگو کا رخ موڑنا چاہا۔

"ان کی عجیب وغریب بیماری سے بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔"

نواز اس موضوع سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

نواز تفصیل سے فری کو شبو کی بیماری کے متعلق بتانے لگا۔ عمر میں تو وہ شبو سے چھوٹی تھی۔ لیکن تھی ذہین — شبو کی ذہنی کیفیت کو فوراً بھانپ گئی۔

رات اس نے شبو سے کھل کر بات کی۔ دونوں بہنیں دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہیں — شبو اب بھی پریشان تھی۔

"فری تم جو چاہے کہو — لیکن میں — میں لبنیٰ کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی — میں نے سب کچھ پا لیا۔ لیکن میرا سکون و قرار لٹ چکا ہے۔ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی — بے گناہوں کی آہیں عرش ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ بھلا مجھے وہ کیوں کر نہ جلا دیں گی۔"

وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

فری چند لمحے چپ رہی — پھر آہستگی سے بولی۔ "اس بارے میں جتنا سوچو گی۔ اتنا ہی ڈوبو گی۔ جو ہو چکا۔ اب اس پر پچھتاوہ لاحاصل ہی ہے۔ وقت سے فائدہ اٹھاؤ — سب کچھ بھول جاؤ۔"

"یہ ناممکن ہے فری — قدر کسی سے جدا ہو کر ہی آتی ہے

میں خود بھی نہ جانتی تھی کہ وسیم کے لیے میری روحانی اور ذہنی مانگ اتنی شدت بھی اختیار کر سکتی ہے۔"

"جانے بھی دو شبو — جذباتی بن کر نہیں سوچو — ذرا سنجیدگی سے غور کرو — وسیم میں تھا ہی کیا۔ جو اس کے لیے یہ فردوسی زندگی تلخ بنا رہی ہو۔"

"تم کبھی نہ سمجھ سکو گی — کچھ معاملے دل کے بھی ہوتے ہیں۔"

"دل کے معاملے دماغ کے فیصلے پر قربان کر چکی ہو۔ اس کا بھی تو خیال رکھو نا؟"

"زندگی کی اس شاید غلطی کی سزا ہی تو بھگت رہی ہوں —"

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"فری — میں وسیم کے بغیر تو شاید جی لوں۔ لیکن لبنیٰ کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

"اس طرح تو ضرور ہی لبنیٰ کو پا لو گی۔"

"تو پھر میں کیا کروں فری — کوئی راستہ تو دکھاؤ — ورنہ میں تو اندھیروں میں بھٹک بھٹک کر دم توڑ دوں گی۔"

فری شبو کی باتوں سے بڑی متاثر نظر آتی تھی۔ لیکن وہ ہمدردی کے جذبوں کا کھلم کھلا اظہار کر کے شبو کو شہ نہیں دینا چاہتی تھی۔

"لبنیٰ کے بارے میں تم نے کبھی نواز سے بات کی ہے؟" فری نے کچھ دیر سوچوں میں گم رہنے کے بعد پوچھا۔

"نہیں ــــ"

فری نے شنبو کی طرف دیکھا۔ کتنی ویرانیاں مسلط تھیں اس کے چہرے پر ــــ

"تم کسی وقت اس سے بات کر کے دیکھو تو سہی۔"

"نہیں فری ــ وہ کہاں مانے گا۔"

"ہوں ــ"

"یوں بھی آج کل کچھ چڑچڑا سا ہو گیا ہے۔"

"تمہارے رویے کا اثر ہے۔"

"تو میں کیا کروں فری ــــ میرا دل میرے بس میں نہیں۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے۔ اس کا منہ نوچ لوں ــــ تم کیا جانو ــــ میں کس طرح اس کے ساتھ دن گزار رہی ہوں ــــ"

"یہی تو تمہاری غلطی ہے ــــ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی۔ تو اب تک بچی کو پاس لے بھی آئی ہوتی ــ"

"ہونہہ ــ"

"ہاں شنبو ــــ سچ کہہ رہی ہوں۔ تم نے لبنیٰ کو پاس بلانے کی کوشش ہی نہیں کی۔"

"کیسے کرتی کوشش ؟"

"نواز کا دل جیت کر۔ یہ کچھ ایسا مشکل مرحلہ تو نہیں۔"

"اس سے زیادہ شاید ہی کوئی مشکل مرحلہ ہوگا۔"

"اپنی بچی کی خاطر ہی برداشت کر ــــ"

شنبو چپ ہو گئی۔ فری نے اسے اونچ نیچ سمجھائی۔ نواز کا دل جیت کر وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ وہ اسے اس کا دل جیتنے کے گُر سکھانے لگی:

"دو ماہ ہو چکے تمہاری شادی کو ــــ لیکن دیکھ رہی ہوں کہ اسے اپنے قریب لانے کی بجائے تم اسے دور بھگا رہی ہو ــــ ابھی تو نئی نئی بات ہے۔ وہ تمہاری پروا کر رہا ہے۔ لیکن تم نے یہی وطیرہ رکھا تو منہ لگانا ہی چھوڑ دے گا۔ بچی تو بچی، اپنے آپ کو بھی نہ پا سکو گی۔"

شنبو چپ چاپ سوچتی رہی۔

"مانا ــ کہ تمہیں اپنے اوپر جبر کرنا پڑے گا ــــ لیکن بچی کی خاطر یہ گوارا کر لو ــــ نواز کو اتنا لبھاؤ۔ کہ تمہاری کسی بات سے انکار کی اس میں تاب ہی نہ رہے ــ اسے اتنا خوش رکھو کہ تمہارے اشارے پر جان دینے کو تیار ہو جائے ــــ"

شنبو فری کی باتوں پر پہلی بار مسکرائی۔

فری کو اس کی یہ مسکراہٹ یوں لگی جیسے بند زخموں کے منہ کھل گئے ہوں ــ درد کے ابھرتے جذبات کو روک کر وہ شنبو کو سیدھی راہ پہ لانے کی کوشش کرنے لگی۔

"لیکن وسیم لبنیٰ کو چھوڑ دینے پر آمادہ کیوں کر ہوگا؟" شنبو گہری سوچ میں ڈوبے ڈوبے بولی۔

"آمادہ ہوگا کیوں نہیں ــ اللہ جانے بچی اس کے لیے کیا مصیبت

بنی ہو گی۔ ماں زندہ ہوتی تو پھر شاید نہ ہی دیتا۔ اب تو میرا خیال ہے اشارہ کی دیر ہو گی — بچی کو بھیج دے گا۔"

"یہ بہلاوہ ہی ہے فری —"

"بہلاوہ نہیں شبّو — یوں واپس نہ کرے گا۔ تو قانون کا سہارا لے لیں گے۔ پہلے تم راہ تو ہموار کرو۔"

"میں پورے خلوص سے کوشش شروع کروں گی۔"

"آج ہی سہی —"

"لبنیٰ کے لیے میں سب کچھ سہہ گزروں گی فری —"

"خدا تمہارے عزم کو تقویت دے —"

شبّو بڑی مطمئن نظر آنے لگی — عمل تو بڑا صبر آزما تھا لیکن اس نے منزل پانے کا تہیہ کر لیا۔

چوڑے دریچے کے پردے اٹھے ہوئے تھے۔ نیلے نیلے شفاف آسمان پر چمکتے ہوئے پورے چاند کی سیمیں کرنیں دریچے سے اندر آ رہی تھیں۔ خواب گاہ کی مدھم سبز روشنی میں کرنیں مدغم ہو جانے کو تڑپ رہی تھیں۔

نرم و گداز پلنگ پر شبّو لیٹے لیٹے اونگھ گئی تھی۔ نواز ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ شبّو اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ تھک کر وہ لیٹ گئی اور لیٹتے ہی سو گئی۔

ہوا کی مدہوشیوں سے کھڑکی کے کواڑوں نے مستانہ سی جنبش کی آہٹ سے شبّو کی آنکھ کھل گئی۔

وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی — آنکھیں ملتے ہوتے ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ نواز ابھی تک نہ آیا تھا — اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔

وہ پلنگ سے اتر کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ چودھویں کا پورا چاند سینۂ
چرخ پر چمک رہا تھا۔ اس نے نظر بھر کر اس چاند کو دیکھا۔ اور لاشعوری طور
پر وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئی۔

اسے اپنی سہاگ رات یاد آ گئی۔

وہ سہاگ رات

جو اس نے وسیم کے ساتھ گزاری تھی۔

ارمانوں سے بھرپور رات۔

اسی رات کے رنگین اور مچلتے لمحوں میں اس نے اسی چاند کو گواہ رکھ
کر اپنی ابدی وفا کا وسیم کو یقین دلایا تھا۔

اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں ——— لیکن بند آنکھوں کے سامنے
سے کتنے مناظر کچھ اور بھی اجاگر ہو گئے۔

یادِ ماضی کتنا بڑا عذاب تھا ——— کاش اس کا حافظہ اس سے چھن
جاتا ——— لیکن کتنی عبث تھی یہ خواہش ———!

وہ بڑی دیر بے حس سی کرسی پہ پڑی رہی ———

وہ ڈوبتی گئی۔

ڈوبتی گئی۔

ہوا کی مدہوشیوں نے اک بار پھر اسے چھیڑا ——— سر اٹھا کر وہ کھڑکی
کی طرف دیکھنے لگی۔ چاند اب بھی جھانک جھانک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ اٹھی اور تیزی سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے ——— سر کو دونوں

ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے وہ ماضی کے عذاب سے اپنے آپ کو
چھٹکارہ دلانے لگی۔

"وہ کسی جذباتی کمزوری کا مظاہرہ نہ کرے گی ———" اس نے بلند
آواز سے کہا۔ اندر کی عورت مچلی ہوئی تھی۔

لیکن

شبو نے بڑی محبت سے اس عورت کو سلا دیا۔ آج کل وہ کتنی
کاوشوں سے نواز کی دلجوئی میں مصروف تھی۔ کس کس طرح اسے لبھا رہی
تھی ——— یہ جذباتی کمزوری تو اس کے بنے بنائے پلان کو خاک میں ملا
دے گی ———

اپنے آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے وہ اٹھی ——— گھڑی دیکھی۔ بارہ
بجنے کو تھے۔ نواز کا اسے انتظار تھا۔ اس انتظار میں کوئی بھی بے قراری یا
ذہنی اضطراب نہیں تھا۔ ہاں دکھاوے کا بہت کچھ تھا۔

تھوڑی دیر بعد نواز آ گیا۔ شبو پلنگ پر لیٹی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

"ہائے اللہ ——— کہاں تھے آپ ———" شاکی لہجے میں شبو بولی۔

اس نے رسالہ پرے پھینک دیا۔

"اوہ ——— تو تم ابھی تک جاگ رہی ہو ———" نواز شبو کے قریب
بیٹھتے ہوئے بولا۔

"سو کیسے جاتی؟" شبو نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

"مجھے پتہ ہوتا تو میں کبھی اتنی دیر نہ لگاتا ——— میں تو سمجھا تم حسب

عادت نو بجے سوگئی ہوگی ـــ" نواز نے اس کا گال تھپ تھپایا۔

"تو جان بوجھ کر دیر لگائی آپ نے؟" شبّو نے روٹھ کر منہ پھیر لیا۔

"نہیں شبّو ـــ بخدا میری بھی سنو" وہ اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے جھکا ـــ" آج مال آیا ہے۔ گوداموں میں لگوا رہا تھا۔"

"سارا کام آپ ہی نے تو کرنا تھا" شبّو کا انداز اب بھی روٹھا روٹھا تھا ـــ

نواز اس قاتل انداز سے بچنے کی ہمت کیوں کر کرتا ـــ جھک کر اس نے شبّو کو پیار کر لیا ـــ

"جائیے ہم نہیں بولتے آپ کے ساتھ" وہ اک ادائے دل نواز سے مسکرائی ـــ

"بھئی معاف کر دو ـــ" نواز نے ہنستے ہوئے ہاتھ باندھ دیئے "آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی"

شبّو کھلکھلا کر ہنس دی۔ ہاتھ باندھے وہ کتنا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

نواز نے مستی کے عالم میں اسے اور گدگدایا ـــ شبّو مچل مچل کر قہقہے لگاتی رہی۔

نواز کتنا خوش تھا۔ شبّو اس وقت اس سے جان بھی مانگ لیتی تو وہ دینے سے گریز نہ کرتا۔

لیکن شبّو نے اس وقت کچھ نہیں مانگا ـــ وہ تو ابھی راہیں ہموار کر رہی تھی۔

شب و روز کا چکر چلتا رہا۔ نواز پر نوازشوں کی بارش ہوتی رہی۔ شبّو کا التفات دن بدن بڑھتا گیا۔ نواز جو اس کے آئے دن کے نخروں سے جھلا کر رہ گیا تھا، مسرور و مطمئن ہو گیا۔

کلب میں دعوت تھی۔ شبّو نے نارنجی رنگ کی بھاری بھاری پلّوؤں والی ساڑھی نکالی۔

"وہ ساڑھی تو تم نے پہن کر دکھائی نہیں" نواز نے نارنجی ساڑھی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کونسی؟" شبّو کا دل دھک سے رہ گیا۔

"وہی آسمانی ـــ جسے جناب نے غصے میں آکر ـــ دیوار سے دے مارا تھا" نواز نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

شبّو کا قیافہ ٹھیک تھا نا ـــ نواز اسی آسمانی رنگ کی ساڑھی کے متعلق ہی تو کہہ رہا تھا۔

"وہ رنگ مجھے ذرا پسند نہیں ـــ"

"کیوں ـــ اتنا خوب صورت رنگ ہے ـــ ہلکا آسمانی ـــ پہن کر دیکھو ـــ یہ چاند سا چہرہ کیا بہار دے گا اس ساڑھی میں ـــ"

اس نے پیار سے شبّو کا چہرہ تھام لیا۔

شبّو کے جذبات متلاطم ہونے کو مچلے ـــ لیکن اس نے طوفان کو راہ نہ دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ کتنا جبر کیا اس نے ـــ لیکن اپنے گناہوں کی سزا سمجھ کر وہ ہر اذیت جھیل لینے پر آمادہ تھی۔

اس نے آسمانی ساڑھی نکالی ـــــ کانوں میں مترنم سی سرگوشی ابھری۔ جسم نے مضبوط ہاتھوں کا تناؤ محسوس کیا ـــــ لیکن ـــــ وہ بیگانہ سی بنی ساڑھی کی تہیں درست کرنے لگی۔

"واللہ! کیا چیز بن گئی ہو ـــــ ذرا آئینے میں دیکھو ـــــ" وہ اسے گھسیٹ کر آئینے کے سامنے لے آیا۔

شبنو نے آنکھیں بند کر لیں۔ ماضی کے ان جھروکوں میں جھانک کر وہ سسکتے لاشے دیکھنے کی تاب کہاں رکھتی تھی۔

نواز اس کی تعریفیں کر رہا تھا ـــــ وہ مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ نواز نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا ـــــ وہ لچکیلی شاخ کی طرح اس کے بازوؤں پر جھول گئی۔

"شبنو ـــــ آج تم نے زندگی بخش دی ہے مجھے ـــــ" اس نے سرگوشی کی ـــــ "دل خوش کر دیا ـــــ"

شبنو اب بھی مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کی سوگوار آنکھوں میں اب بھی بجھتے دیپ کا دھواں تھا ـــــ نواز کو زندگی بخش دینے میں اس کے جذبات کی کتنی موتیں واقع ہوئی تھیں۔

کاش! اس کے ویران دل میں کوئی جھانک کر دیکھ سکتا۔

دونوں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلے ـــــ گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ شبنو اپنا بڑا سا بٹوہ لیے اگلی سیٹ پر جا بیٹھی۔

نواز نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے گاڑی چلا دی۔

"آج ساحرہ سے تمھارا مقابلہ ہے۔"

"کس بات کا؟"

"بڑا حسین سمجھتی ہے اپنے کو۔"

"سمجھتی کیا ہے؟ ہے تو واقعی حسین۔"

"لیکن تم سے بڑھ کر نہیں۔ آج تمھیں دیکھ کر ـــــ"

"ہٹیے بھی ـــــ آپ کو تو جانے کیا ہو گیا ہے۔"

شبنو لجا کر بولی۔ دل میں سوچ رہی تھی۔ کہ وہ کتنی عمدہ اداکاری کر سکتی ہے۔ آسمانی ساڑھی شکنجے کی طرح اس کے وجود کو جکڑے ہوئے تھی ـــــ لیکن اس کے باوجود وہ نواز کی دلداری کی باتیں کیے جا رہی تھی۔ نواز آج بے طرح خوش تھا۔ شبنو نے سارا اہتمام اسے لبھانے ہی کو تو کیا تھا۔

آج رات وہ لبنیٰ کے متعلق نواز سے ضرور بات کرے گی۔ اب تو نواز اس کے اشارۂ ابرو پر سدھائے ہوئے بندر کی طرح ناچنے لگتا تھا۔ راہیں ہموار ہو گئی تھیں۔ آج وہ لبنیٰ کو اپنے ہاں لانے کے لیے نواز کو راغب کر لینے کے تصور سے بھی تو خوش تھی۔

چوک میں ٹریفیک رکی ـــــ نواز نے بھی گاڑی روک لی۔ موٹر کے دونوں طرف پیادہ چلنے والے گزر رہے تھے۔

"بڑی کوفت ہوتی ہے ـــــ" شبنو نے بیزاری سے کہا۔

"کس بات کی؟" نواز نے پوچھا۔

"یہ گاڑی رک جانے کی ——" وہ نواز کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی "جہاں گاڑی رکی —— راہ چلنے والے بھی رک گئے —— کس ندیدے پن سے گھورتے ہیں۔"

"ان کا کیا قصور؟" نواز ہنسا۔

"کیوں؟"

"تم میں تو لیل و نہار کی گردش روک لینے کی طاقت ہے۔ ان راہ چلتوں کا کیا قصور؟ —— ظالم تو چیز ہی ایسی ہے ——" نواز نے گردن اس کی طرف جھکاتے ہوئے اس کے بالوں کو چھوا۔

"ہٹیئے بھی ——" شبو نے جلدی سے چہرہ ہٹا کر رخ باہر کی طرف کر لیا۔

لیکن!

اس کا دم ایک دم رک گیا۔

آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔

رنگ فق ہو گیا۔

راہ گیروں میں وسیم بھی تھا۔ فٹ پاتھ پر یمنیٰ کا ہاتھ پکڑے وہ مخالف سمت جا رہا تھا۔ اس نے شبو کو دیکھا یا نہیں لیکن شبو نے اسے دیکھ لیا۔

اس نے نسواری رنگ کا پوری آستین کا وہی سویٹر پہن رکھا تھا جو شبو نے آج سے تین سال پہلے بُنا تھا —— سویٹر وہی تھا۔ لیکن اس کا چہرہ تین سال پہلے کے وسیم سے کتنا بدل چکا تھا۔

اور

پھر

اس کا جی چاہا موٹر سے کود کر اپنی بچی کو سینے میں چھپا لے۔

لیکن کود جانا تو ایک طرف، وہ تو گردن گھما کر جاتے ہوئے وسیم اور یمنیٰ کو نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت بھی نہ کر سکی۔ سیٹ پر بے جان بت کی طرح پڑی رہ گئی۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھی سکت نہ رہی۔

راستہ ملنے پر گاڑی چل دی۔

نواز باتیں کرتا رہا۔ لیکن شبو کا بے حس وجود گاڑی کی سیٹ پر پڑا تھا اس کی روح کہیں اور بھٹک رہی تھی۔

طبیعت کی یک لخت خرابی کی وجہ نواز نہ جان سکا۔ بدمزگی سے وقت گزار کر دونوں واپس آ گئے۔

شبو کا بنا بنایا پلان کسی ادھورے خواب کی طرح بکھر گیا۔

رات

نواز سے بات کرنا تو در کنار۔ وہ تو اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھی،

دوسرے دن نواز کو کام کے سلسلے میں چند دن کے لیے باہر جانا پڑا یہ بھی اچھا ہوا۔ ورنہ شبو کے قریب رہ کر اس پر ان دنوں کئی راز منکشف ہو جاتے۔

شبو اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی تھی۔ وسیم آج کل یہاں تھا۔ وہ یہاں کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ —— کب آیا —؟

ان سوالوں کے جواب اسے کہاں سے ملتے۔ اس کی بچی اسی شہر میں تھی۔ اسی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا شہر کا ایک ایک چپہ کھوج ڈالے۔

انہی دنوں اس پر یہ روح فرسا انکشاف بھی ہوا۔ کہ وہ نواز کے بچے کی ماں بننے والی ہے —— اس کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ بیٹھے بیٹھے برف کی طرح ٹھنڈی ہو جاتی —— پسینے چھوٹ جاتے —— ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت نہ رہتی —— چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ یوں لگتا جیسے تقدیر

کے سامنے اب وہ پوری طرح بے بس ہو چکی ہے۔

نواز کئی دن کے بعد واپس آیا تو شبو کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ تو مدتوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔

نواز نے ڈاکٹر کو بلایا۔

ڈاکٹر نے شبو کو دیکھا۔ اس سے کئی سوال کیئے۔ اور جب واپس جانے لگا۔ تو مسکرا کر نواز کی طرف دیکھا "فکر کی بات نہیں نواز صاحب — بعض عورتوں کی ان دنوں حالت ایسی ہو ہی جاتی ہے —— تین چار مہینے گزرنے پر طبیعت خود بخود سنبھل جائے گی —"

نواز کے ذہن سے بہت سے بوجھ اٹھ گئے —— ڈاکٹر کو رخصت کرنے کے بعد وہ شبو کے پاس آیا۔ بڑے پیار سے بولا "بڑا چھوٹا سا دل ہے۔ ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتیں ——"

شبو چپ پڑی رہی۔

"اک پیاری سی بیٹی —— بس —" نواز نے اسے چھیڑا۔

لیکن یہ چھیڑ کن زخموں کو چھیڑ گئی۔ نواز کیا جانتا تھا۔

شبو نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ لیکن اب نواز متفکر نہیں تھا ——

نیا انکشاف جان لیوا سہی۔ لیکن پھر بھی اک پردے کا کام کر گیا۔ شبو پہ جب بھی ذہنی پریشانیاں مسلط ہوتیں اور بے قراریاں بڑھ جاتیں۔ نواز اسے اہمیت نہ دیتا۔ ڈاکٹر کے الفاظ تسلی کو کافی تھے نا ——

ویسے اس نے شبو کی ناز برداریوں میں اضافہ کر دیا ـــــ اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگا۔ نئی اور چہیتی بیوی اس کے بچے کو جنم دینے والی تھی نا؟

شام سینما کا پروگرام تھا۔

"ساڑھے چھ بجے تک چلیں گے ـــــ تم چھ بجے تیار ہو جانا ـــــ"

نواز اپنے دفتر جانے سے پہلے شبو کو تاکید کر گیا۔

شام شبو تیار ہو گئی ـــــ آج طبیعت کچھ زیادہ ہی پریشان تھی۔

لیکن چھ بج گئے نواز نہیں آیا ـــــ سینما کا اسے کوئی خاص شوق نہ تھا۔ نہ ہی نواز کے ساتھ جانے کی تمنا تھی۔ تیار تو وہ صرف اس لیے ہوئی تھی کہ مصروفیت کے لمحے گزارنا تھے۔

سات بجے تک اس نے انتظار کیا نواز نہیں آیا۔ وہ کچھ بے چین سی ہو گئی۔ جانے اس کا دل کیوں ڈول رہا تھا۔

آٹھ بجے اس نے دفتر ٹیلیفون کیا۔

"نواز صاحب تو تقریباً ساڑھے پانچ یہاں سے چلے گئے ہیں" مینیجر نے جواب دیا۔

"لیکن وہ اب تک گھر نہیں پہنچے" شبو نے کہا۔

"ہو سکتا ہے ـــــ کہیں کام چلے گئے ہوں"

مینیجر کے کہنے کے باوجود اسے تسلی نہ ہوئی۔ اس کا اضطراب بڑھتا گیا۔ وہ بے قراری سے چمن میں ٹہلتی رہی۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ نواز ابھی تک نہ آیا تھا۔ شبو کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہو رہا ہے ـــــ طبیعت گرتی جا رہی تھی۔ جانے کیوں دل رونے کو مچل رہا تھا۔

ساڑھے دس بجے کے قریب گاڑی کی آواز پر وہ برآمدے کی طرف گئی۔ نواز موٹر سے نکل رہا تھا۔

"اوہ ـــــ تم چھ بجے سے میرا انتظار کر رہی ہو گی"

"آپ ہی تو کہہ گئے تھے ـــــ"

"کہہ تو گیا تھا ـــــ پہنچ نہ سکا" وہ کچھ گھبرایا گھبرایا سا تھا۔

"خیر تو ہے" شبو نے پوچھ ہی لیا۔

"ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا"

"آپ کا؟"

"ہاں"

"کیسے؟"

"بس ـــــ سمجھ تو خود مجھے بھی نہیں آئی ـــــ سٹیئرنگ پر قابو نہ رہا کچھ ایسا بدحواس ہو گیا"

"پھر؟"

"ایک آدمی گاڑی کے نیچے آ گیا"

"آہ ـــــ" شبو کی آنکھیں پھیل گئیں ـــــ خوف سے اس کا رنگ پیلا ہو گیا۔

نواز نے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

"فکر کی بات نہیں — شکر ہے آدمی مر نہیں گیا —"

"بچ گیا؟"

"زخمی ہو گیا ہے سر پہ چوٹ آئی ہے — خون بہت بہہ گیا۔"

"بیچارہ —"

"اچانک موڑ کاٹنے پہ سامنے آ گیا — میں نے ہمیشہ اعتماد سے گاڑی چلائی ہے۔ اس وقت اللہ جانے میں کیوں ایسا بدحواس ہوا۔"

شبو اس خبر سے اب تک متوحش نظر آ رہی تھی — نواز اسے سہارا دے کر کمرے میں لے گیا۔

"اسے ہسپتال پہنچایا — مرہم پٹی ہوتے یہ وقت ہو گیا۔ ابھی تک تو اسے ہوش نہیں آیا تھا — پولیس سے بھی نپٹنا پڑا —"

"کیس بن جائے گا۔"

"وہ تو خیر بنے گا ہی۔ لیکن فکر نہ کرو تم — نپٹ لیں گے۔ آدمی شریف دکھائی دیتا ہے۔ کچھ نہ کچھ کر لیں گے — دانستہ تو نہیں اتفاقی حادثہ ہے —"

لیکن حادثہ اتفاقی ہونے کے باوجود نواز بڑا متاثر نظر آ رہا تھا۔

شبو کی تو حالت ہی اور تھی۔

رات اسے اچھی طرح نیند نہ آتی۔ وہ بار بار چونک جاتی — ایک ہی سوال ذہن میں متحرک رہا تھا — "کیا وہ نواز کے لیے اتنی بے چین

تھی —" اثبات کو اس کا دل تیار نہ تھا۔

لیکن

نفی بھی نہ ہو سکتی تھی — چھ بجے سے گیارہ بجے تک اس نے کس طرح وقت گزارا تھا۔

تو کیا وہ لاشعوری طور پر نواز سے قلبی ناطہ جوڑ چکی تھی۔

اس احساس سے اسے خوشی کی جگہ دکھ ہوا —

اور

وہ رات کے اندھیروں میں کتنی ہی دیر چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔

"پہلے ہسپتال چلتے ہیں" نواز نے گاڑی ہسپتال روڈ پر موڑ دی۔

"کیوں؟"

"ذرا اسے دیکھتے چلیں۔"

"کسے؟"

"وہ جو زخمی ہوا تھا ایکسیڈنٹ میں۔"

"ابھی ہسپتال میں ہی ہے؟"

"ہاں۔"

"زیادہ چوٹیں آئی تھیں؟"

"سر میں چوٹ آئی تھی۔ خون بہہ جانے سے کمزوری بہت ہو گئی۔"

"آپ پہلے بھی دیکھنے آئے تھے اسے؟"

"ہر روز آتا ہوں۔"

"واقعی؟"

"ہاں — بڑا شریف آدمی ہے — روز دیکھنے آنے کا فائدہ یہ بھی ہوا۔ کہ پولیس کی کھینچا تانی سے بچ گئے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس نے بیان ہی اس قسم کا دیا ہے۔ حادثے کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے۔ غلطی تسلیم کر لی ہے۔ اس نے کہا ہے۔ کہ موٹر کو آتے دیکھ کر بھی وہ نہ رکا۔ جلدی میں سڑک پار کرنا چاہی۔"

"سچ؟"

"ہاں۔"

"واقعی کوئی شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں جی — بہت کچھ کہہ سکتا تھا — لیکن سارا جرم اس نے اپنے سر لے لیا — میں نے تذکرہ کیا بھی تھا۔ ہنس دیا — کہنے لگا۔ جو ہو چکا سو ہو چکا — پولیس کی لوٹ کھسوٹ سے کیا فائدہ؟"

"پھر تو آپ کو اس کا احسان مند ہونا چاہیئے۔"

"ہوں تو سہی — سوچ رہا ہوں اس احسان کا بدلہ کیسے چکاؤں۔ میرے خیال میں ہسپتال کے سارے اخراجات میں ادا کر دوں گا۔"

"ضرور —"

ہسپتال کا گیٹ آ گیا — دونوں کا سلسلہ گفت گو منقطع ہو گیا۔

بڑی سی گاڑی دیکھ کر چوکیدار نے تعظیم سے گیٹ کھول دیا۔

گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے دونوں باہر نکلے — مشتبہ نے اپنا

زنگالی دوپٹہ ٹھیک کیا۔ بٹوا پکڑا اور نواز کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"اوپر کمرہ ہے ۔۔۔ سیڑھیاں چڑھ لوگی ۔۔۔" نواز نے شبو کو مسکرا کر دیکھا۔ شبو نے اسے صرف دیکھا۔ چپ چاپ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

ہسپتال کی فضا پر منجمد سی سنجیدگی طاری تھی۔ اس منجمد سنجیدگی کا اثر تھا یا شبو ابھی تک زخمی کی شرافت سے متاثر تھی۔ بہر حال وہ کچھ ڈوبی ڈوبی سی تھی۔"

کمرہ نمبر آٹھ کے سامنے نواز رکا۔

"طبیعت ٹھیک تو ہے نا؟" وہ ٹھٹک لیا۔

"جی" شبو نے جواب دیا۔

"پٹیوں میں جکڑے ہوئے مریض کو دیکھ کر ہمت نہ ہار بیٹھنا۔"

"اتنی کم حوصلہ نہیں ہوں۔"

نواز کے دروازہ کھولنے سے پہلے اندر سے نرس برآمد ہوئی۔

"اندر کوئی ہے؟" نواز نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ مریض اکیلا ہی ہے۔" وہ جواب دے کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ نواز نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔

شبو اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئی۔

ہسپتال کا اک درمیانہ سا کمرہ تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر سفید پردے لہرا رہے تھے۔ کونے میں میز پڑی تھی۔ دوسرے میں چھوٹی سی الماری۔ دیوار سے ذرا ہٹ کر لوہے کا پلنگ بچھا تھا۔ جس پر موٹے سے گدے

والا سفید بستر تھا۔ قریب ہی ایک کرسی اور ایک سٹول پڑا تھا۔

بستر پر سفید چادر اوڑھے دیوار کی طرف منہ کیے زخمی پڑا تھا۔ سر پر سفید سفید پٹیاں بندھی تھیں۔ جن پر کہیں کہیں سرخ اور زرد دوائیوں کے نشان بھی تھے۔

شبو نے اک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔ اور پھر لاپرواہی سے میز پر رکھی ہوئی دوائیوں کو دیکھنے لگی۔

نواز پلنگ کے قریب گیا۔

کروٹ کے بل لیٹے زخمی کے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھ کر اس پر جھک گیا۔

"اوہ ۔۔۔ آپ ۔۔۔" نحیف سی آواز آئی ۔۔۔ زخمی نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہیئے ۔۔۔ لیٹے رہیئے" نواز نے کہا۔

اور آواز پر شبو نے پلٹ کر دیکھا۔

پہلی نگاہ اچٹتی سی تھی۔

لیکن

دوسری

نگاہ سے کہیں زیادہ اک دھماکہ تھی۔

وہ ساکت سی کھڑی زخمی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"بیگم نواز اور ۔۔۔ مسٹر وسیم" شبو اور پلنگ کے درمیان کھڑا نواز

تعارف کروا رہا تھا۔

وسیم کی آنکھیں پوری کھلی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی دیوانہ جاگتے میں انوکھا سا خواب دیکھ رہا ہو۔

"بیگم روز آنے کا اصرار کرتی تھیں۔ جب سے آپ کے ایکسیڈنٹ کا سنا بہت متاثر تھیں۔" نواز کہہ رہا تھا۔

لیکن سُن شبو رہی تھی نہ وسیم ——— دونوں پہ جمود کی ایک سی کیفیت طاری تھی۔ کرسی کے ہتھے پر شبو کے ہاتھوں کی گرفت نہ ہوتی تو شاید وہ چکرا کر زمین پر گر چکی ہوتی۔

وسیم کا اٹھا ہوا سر تکیے پر گر گیا۔ اس نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ اس کا سانس رُکنے لگا۔ اسے یوں لگنے لگا۔ جیسے وہ عالمِ نزع میں ہو——— اور کوئی دم میں آخری ہچکی اسے غمِ زندگی سے ہمیشہ کے لیے چھڑا دینے والی ہو۔

نواز نے اس کے چہرے پر اذیت کے بڑے واضح آثار دیکھے——— جلدی سے ہاتھ کا سہارا دے کر اس کا تکیہ درست کیا۔ "آپ نے خواہ مخواہ اٹھنے کی کوشش کی وسیم صاحب ——— آپ کو زیادہ حرکت نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

وہ کئی لمحے چپ چاپ پڑا رہا ——— جیسے آخری ہچکی آنے کے بعد نعش بے حس و حرکت ہو جاتی ہے۔

"تکلیف زیادہ ہے تو ڈاکٹر کو بلاؤں" نواز ملائمت سے اس پر جھکتے ہوئے بولا۔ چہرے [illegible] اذیت کے آثار ہویدا تھے۔ دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر وہ اضطراب [illegible] میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کے

نتھنے بھی پھڑک رہے تھے۔ سانس بھی غیر متوازن تھا۔

کوئی جواب نہ پا کر نواز جلدی سے مڑا——— شبو کرسی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کمرے سے نکل گیا۔

نواز کمرے سے چلا گیا۔

وسیم اور شبو تنہا رہ گئے۔

اُف وہ قاتل لمحے۔

دونوں پتھرائی ہوئی لاشوں کی طرح تھے ——— اس اچانک ٹکراؤ نے روح تک کو منجمد کر ڈالا تھا۔

چند لمحے یونہی گزر گئے۔

اور پھر جیسے نزع کے عالم میں حیات نے جیت جانے کی سعی کی ہو۔ وسیم کے جسم کا تشنجی اکڑاؤ کچھ کم ہوا۔ اس نے ماتھے سے ہاتھ ہٹائے ——— آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔

اور

اپنے سے چند فٹ کے فاصلے پہ بیٹھی ہوئی شبو کو دیکھا۔

دکھ کی تیز دھار شبو کے بے حس وجود پر پڑی ——— وہ کپکپا اٹھی۔ اک لمحہ کو اس کی نظریں اٹھیں۔ اور وسیم کی ویران آنکھوں سے ملیں۔ نگاہوں کا تصادم دل و جگر میں نشتر بن کر اتر گیا۔ اس پر جان کنی کا سا عالم طاری ہو گیا ——— سانس یوں آنے لگی جیسے کوئی بے چین روح ویرانوں میں سسکیاں بھر رہی ہو۔

وسیم کی نظریں نہیں جھکیں۔

وہ اسے دیکھتا رہا۔

پلنگ کی پٹیوں پر اس کے ہاتھوں کی اضطراری گرفت اس کے طوفانی جذبات کی مظہر تھی۔

وہ شبو کو دیکھ رہا تھا۔

شبو

جو کبھی اس کی بیوی سے زیادہ محبوبہ تھی۔ جس کی خوشیاں — جس کے غم اس کی ذات سے وابستہ تھے۔ جو اس کے دلوں کو معطر کرتی تھی۔ جو اس کی راتوں کو مہکایا کرتی تھی۔ جو اس کی معمولی سی تکلیف پر بھی بے کل ہو جایا کرتی تھی۔

شبو

جس کا جسم چاندنی کی طرح چمکتا تھا۔ جس کے جسم کی نرمی و گرمی کا احساس اب تک اس کے ذہن سے جُدا نہ ہوا تھا۔

اور

جس نے ان سارے زندہ زندہ تعلقات کو بے وفائی کی کُند چھری سے کاٹ ڈالا تھا۔

وسیم پر جذباتی اُتار چڑھاؤ کا اثر ہو رہا تھا۔ ایک دم اسے اپنے دل میں تیزی سے شدت کا احساس ہوا — آنکھیں بند کر کے اس نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

نواز کمرے میں داخل ہوا۔ "عجیب ہسپتال ہے۔ کوئی ڈاکٹر ہی نہیں ملا۔ کیسی ہے طبیعت اب وسیم صاحب —؟"

وسیم کڑیوں تک رہا تھا۔ جیسے اس کا مُردہ جسم قبر میں اتارا جا رہا ہے — وہ اسی انداز میں پڑا رہا —

نواز نے یونہی اس کی نبض پر ہاتھ رکھا — پھر چھاتی سہلانے لگا۔

وسیم نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"کیسے ہیں اب" نواز نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں" انتہائی نحیف آواز تھی۔

"زخموں میں درد تو نہیں —" نواز ہمدردی سے بولا۔

"جی —" وسیم کے لب ہلے — نہ جانے اس جی سے اس کا مطلب کیا تھا۔

پلنگ کے قریب رکھے ہوئے سٹول پر بیٹھتے ہوئے نواز کی نظر شبو پر پڑی۔ وہ کرسی کی پشت پر سر ٹکائے پڑی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں کسی حرماں نصیب کے آنسوؤں کی طرح تھیں — رنگ فق تھا۔ اور ہونٹ سفید پڑ گئے تھے۔

"شبو — شبو —" وہ جلدی سے اُٹھ کر اس کے قریب آیا برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگا۔

"پانی پیو گی —" اس نے میز سے پانی کا گلاس اٹھایا۔ اور اس

کے لبوں سے لگا دیا۔

شبو کی حالت دیکھ کر نواز مطلقاً نہیں گھبرایا۔ ایسے دورے تشویشناک تھوڑا ہی تھے۔ چند ماہ یہی حالت رہنا ہی تھی۔

وسیم اپنے ہنگامی جذبات پر کسی حد تک غالب آچکا تھا۔ وہ اب شبو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے نواز اپنے ہاتھوں سے پانی پلا رہا تھا۔

"ابھی ٹھیک ہو جائیں گی ——" نواز نے گلاس میز پہ رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "تشویش کی بات نہیں۔"

وسیم مجروح نظروں سے اب بھی شبو کو دیکھ رہا تھا۔

"ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے وسیم صاحب ——" نواز مسرت بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔ "اُن کی طبیعت ان دنوں کچھ ——" وہ مسکرا کر دانستہ چپ ہو گیا۔

اس کچھ میں اتنا کچھ تھا کہ اور کچھ سننے کی وسیم میں تاب ہی نہ رہی۔ کئی لمحے وہ چپ چاپ پڑا رہا —— نواز ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ کیا جانتا تھا کہ وسیم کی ہستی کن طوفانوں کی لپیٹ میں آئی ہوئی ہے۔

"کب تک ڈسچارج ہو رہے ہیں آپ ——" اس نے براہِ راست سوال کیا۔

"جی —— پتہ نہیں ——" بڑی ہمت سے وسیم نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کوشش سے وہ اپنے حواس میں آ ہی گیا۔

"زندگی میں پہلی بار ایسا اتفاق ہوا ہے —— آپ کو زخمی کر کے میں

قلبی طور پر متاسف ہوں۔ اس دن نہ معلوم کیوں میں حواس باختہ ہو گیا تھا۔ سٹیرنگ پر گرفت ہی نہ رہ سکی ——"

"لوگ تو دانستہ روند ڈالتے ہیں نواز صاحب" وہ گھمبیر آواز میں بولا۔ "آپ کا حادثہ تو اتفاقی تھا۔"

مٹی کے بت کو یہ آخری ضرب تھی۔ ریزہ ریزہ ہی تو ہو گیا۔

شبو کی متغیر حالت دیکھ کر نواز جلدی سے اٹھا —— "ٹھیک نہیں ہوئی طبیعت —— شبو ——"

شبو کچھ نہیں بولی۔

"معاف کیجئے گا وسیم صاحب بیگم کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو رہی ہے —— میں پھر آؤں گا ——" معذرت کرتے ہوئے اس نے شبو کا بازو تھام کر اٹھایا —— اور اس کے ٹھنڈے وجود کو اپنے بازو سے سنبھالتے ہوئے سر کے اشارے سے وسیم کو الوداع کہی۔ وہ آہستگی سے شبو کو لیکر کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھر آکر بھی شبو نہ سنبھل سکی۔ سوچ میں کچھ اس طرح ڈوبی کہ گرد و پیش کا
بھی ہوش نہ رہا۔
شام سے رات ہو گئی۔ نواز اس کی پٹی سے لگا بیٹھا اس کا دل بہلاتا
رہا ـــ لیکن وہ سوجھ بوجھ سے تو دور ہوتی جا رہی تھی ـــ اس کی باتوں سے
کیا بہلتی ـــ اسے تو چاروں اور پٹیوں میں جکڑا ہوا وسیم نظر آ رہا تھا۔ ادھر
ادھر نینی بلکتی دکھائی دے رہی تھی۔
"تم نے تو بالکل ہی ہمت ہار دی ہے۔ ڈاکٹر پاگل تو نہیں۔ یوں تو ہوگا
ہی ـــ" نہ جانے وہ کیا کیا کہتا رہا ـــ شبو بے حس بے سُدھ سی پڑی
رہی ـــ
رات یونہی گزر گئی۔
صبح شبو نے اپنے حواس پر قابو پا لیا ـــ سوچ بدستور تھی لیکن
اس سوچ کے زاویے بدل چکے تھے۔ وہ سیکورٹی اور تنہائی چاہتی تھی۔

تاکہ اطمینان سے اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں سوچ سکے۔
اسی لیے اس نے اپنے سسکتے بلکتے جذبات کو ایک بار پھر ظاہر داری
کے پردے میں لپیٹ دیا۔ نواز کو مسکراتے ہوئے دفتر رخصت کیا۔
"بڑی بزدل ہو ـــ جھٹ اثر قبول کر لیتی ہو ـــ" نواز اس کی مسکراہٹ
سے مطمئن ہو کر بولا۔
"آپ تو میری بیماری کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے" شبو نے شکوہ کیا
"کوئی ایسا تشویش ناک مرض ہو تو بات بھی ہے ـــ یہ تو خوشی
کا مقام ہے فکر کا ہے کی۔"
وہ ہنستا ہوا موٹر میں بیٹھا ـــ اور شبو کمرے میں آکر اک بار پھر
سوچوں میں مستغرق ہو گئی۔
نینی اس کی سوچوں کا مرکز تھی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کی آرزو شدید
سے شدید تر ہوتی گئی۔ وہ ضرور وسیم کے پاس آتی ہوگی۔ شبو ملاقاتی گھنٹوں
میں ہسپتال جا کر اپنی ممتا کی آنچ کو سرد کرنا چاہتی تھی۔
لیکن کیسے جائے؟ ـــ نواز کا کیا کرے؟ اس کا حل وہ نہ سمجھ
سکی ـــ
قدرت کو شاید اس کی تڑپ پر رحم آ گیا۔ نواز دوپہر گھر آیا۔
"مجھے چند دنوں کے لیے باہر جانا ہے ـــ" وہ کاغذوں کا پلندہ
میز پر رکھتے ہوئے بولا۔
"کیوں؟"

"کاروبار کے سلسلے میں۔"

"تو جائیے۔"

"تمہارا کیا کروں؟"

"کیوں؟"

"ایسی حالت میں اکیلا کیسے چھوڑ جاؤں۔ میرا خیال ہے تمہیں بھی ساتھ لے چلوں۔"

"نہیں — آپ تو خواہ مخواہ فکر کر رہے ہیں۔ ایسا تشویش ناک مرض تو نہیں" وہ جبر کر کے مسکرائی — دل سے تو وہ یہی چاہتی تھی۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں اس نے — اللہ میاں اس کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بھی بخش سکتا ہے۔ وہ خود حیران سی تھی۔ نواز کہیں چلا جائے یہی تو اس کی تمنا تھی۔ تاکہ تنہائی، یکسوئی اور اطمینان سے وہ مستقبل کا فیصلہ کر سکے۔

اس نے اپنے آپ کو خوش و خرم ظاہر کرنے کی بے مثال اداکاری کی — نواز مطمئن ہو گیا۔

"لاکھوں روپے کا معاملہ ہے — میرے نہ جانے سے سارا کاروبار الٹ پلٹ ہو جائے گا۔"

"آپ بے فکر ہو کر جائیے — کوئی ایسی ویسی بات ہوئی۔ تو فون کر دوں گی۔ اس نے ایسی ایسی کئی باتوں سے نواز کو مطمئن کر دیا۔

شام وہ اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔ شبو کے دل و دماغ سے جیسے کئی بوجھ اتر گئے۔

صبح وہ بینی کو دیکھنے کی بے قرار آرزو لیے ہسپتال جانے کو تیار تھی۔ ملاقاتی گھنٹوں سے پہلے ہی وہ ہسپتال پہنچ گئی۔ موٹر واپس بھیج کر وہ خود گیٹ میں داخل ہو گئی۔ سیڑھیاں سامنے ہی تھیں۔ اوپر وسیم کا کمرہ تھا۔ اس کا جی تو چاہا کہ اڑ کر اس کمرے تک پہنچ جائے۔ لیکن پاؤں میں کتنی وزنی بیڑیاں تھیں۔ وہ سیڑھیوں کے عین سامنے والے چمن میں آ بیٹھی — پتھریلے بنچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے نظریں گیٹ پر گاڑ دیں۔

بار بار گھڑی دیکھ کر وہ بینی کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

انتظار کتنا اندوہگین تھا۔

یہ شبو ہی جانتی تھی۔

ملاقات کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے آ گئی تھی۔ اس کی نظریں گیٹ سے ہٹ کر وسیم کے کمرے کی طرف اٹھ گئیں — وہ کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب عجیب سی سوچوں میں کھو گئی۔

کیا شادی نکاح نامے پر دستخطوں اور چند گواہوں کی الٹی سیدھی لکیروں کا نام ہے۔ وہ دلوں کے معاملے — وہ روحوں کے اتحاد کیا ہوئے، اتنے پکے پکے ناتوں کو اتنی کچی کچی ڈوریوں سے کیوں باندھ دیا جاتا ہے۔ ذرا سا تناؤ آیا۔ اور ڈوریاں ٹوٹ گئیں — دلوں کی قربتیں اور روحوں کے جوڑ ان ڈوریوں کے ٹوٹنے سے کیسے ٹوٹ گئے؟ کیسے ٹوٹ گئے؟

وہ مجسم سوال بنی بیٹھی رہی۔

ملاقاتوں کا وقت شروع ہونے پر اس کی سوچوں کا جمود ٹوٹا۔ بینا بی

سے وہ گیٹ کے اندر آنے والوں کو دیکھنے لگی۔

ملاقات کا وقت ختم ہو گیا — ملاقاتی واپس جانا بھی شروع ہو گئے
شبو کو لبنیٰ نظر نہ آئی — مایوسیوں نے اس کا منہ چڑایا — لیکن وہ اپنی
جگہ سے ہلی تک نہیں — شام کے وقفۂ ملاقات کا انتظار کرنے لگی۔
کبھی ٹہل کر — کبھی بیٹھ کر — کبھی گھوم پھر کر اس نے وقت
گزارا — وقت گزارنا کتنا مشکل تھا۔ لمحوں کا بوجھ اس کے سینے پر سلوں
کی طرح پڑ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے وقت گزرا گیٹ ایک بار پھر کھل گیا۔ ملاقاتی آنا شروع
ہو گئے۔

شبو کی نظریں گیٹ پہ جامد ہو کر رہ گئیں۔

ایک دم اس کا دل دھڑک اٹھا — ملاقاتیوں کے ہجوم میں اسے
بوڑھی ملازمہ کا چہرہ نظر آ گیا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا —
اس کے ساتھ ساڑھے چار سالہ لبنیٰ بھی تھی۔

لبنیٰ

جسے پہلی نظر میں وہ پہچان نہ سکی۔

لیکن

جب پہچان لیا۔ تو سینے میں ہوک سی اٹھی — کلیجہ پھٹنے لگا سر
کو دونوں سے تھام کر وہ تھپڑ یلے بنچ پر بیٹھ گئی۔

ملازمہ اور لبنیٰ سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

شبو نے سر اٹھا کر ایک بار پھر دیکھا۔

اب وہ نسبتاً قریب تھیں۔ اور وہ انہیں درخت کی اوٹ سے بڑی
اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔

لبنیٰ نے سبز رنگ کا لمبا سا فراک پہن رکھا تھا۔ فراک جیسا بھی تھا۔
لیکن معلوم ہوتا تھا۔ اس کی سلوٹیں استری کی بجائے ہاتھ سے نکالنے کی
کوشش کی گئی ہو — پاؤں میں جرابوں کے بغیر بوٹ تھے۔ سر میں خوب
تیل ڈال کر کنگھی کی ہوئی تھی۔ بال چپڑے ہوئے کھوپڑی کے ساتھ چپک
گئے تھے۔ آدھی پیشانی بھی تیل سے تر تھی۔ ایک ہاتھ میں روٹی کا ڈبہ پکڑے
وہ ڈبے کے بوجھ سے اسی جانب جھکی ہوئی بمشکل قدم اٹھا رہی تھی۔ ملازمہ
نے شاید کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ وہ دونوں شاید سستانے کے لیے
سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئیں۔

لبنیٰ کے چہرے پر معصومیت سے کہیں زیادہ پختگی کے آثار تھے
وہ اپنی عمر سے آگے نکلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

اس کا دل خون ہو گیا۔ مٹی کے ڈھیر کی طرح وہ بنچ پہ گر گئی۔

کافی دیر بعد اس نے حرکت کی۔ سر اٹھا کر دیکھا — ملازمہ اور لبنیٰ اوپر
کب کی جا چکی تھیں۔

وہ اٹھی۔

اور با ارادہ یا بلا ارادہ — اس کے قدم سیڑھیوں کی جانب اٹھنے
لگے۔

کمرہ نمبر ۵ کے دروازے کی بجائے وہ پچھلی کھڑکیوں کی طرف گئی۔ جالی دار کھڑکی کا سفید پردہ ذرا سا سرکا ہُوا تھا۔ اسی کھڑکی کے قریب ہی تو وسیم کا پلنگ تھا۔

اس نے اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔

وسیم کے بازو پر سر رکھے لبنیٰ لیٹی تھی۔ ملازمہ کمرے میں نہیں تھی۔ وسیم لبنیٰ سے ننھی منی باتیں کر رہا تھا۔

"ابو" لبنیٰ ایک دم اُٹھ کر باپ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہوں" وسیم نے زور سے اس کے ماتھے کا تِل پونچھا۔

"گھر چلو نا ابو ـــــ" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کیوں" وسیم نے پیار سے پوچھا۔

مجھے رات ڈر لگتا ہے ابو ـــــ گھر چلو نا ـــــ" وہ ایک دم سے رو پڑی۔ وسیم نے اسے سینے سے لگا لیا ـــــ کون جانے اس سینے میں اس لمحہ کتنی قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں ـــ

ڈرپوک بیٹی" وسیم نے پیار سے اس کا چہرہ اٹھایا۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اتنی سی عمر میں کتنے دُکھ جھیل ڈالے میری بچی نے" اس کی آواز گلوگیر تھی۔

لبنیٰ کو سینے سے لگائے وہ کتنی دیر ہی چپ چاپ پڑا رہا۔

شبو سے اور کچھ نہ دیکھا گیا ـــــ وہ واپس پلٹی اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر گئی۔

دل کی لگی بُری ہوتی ہے۔

شبو جذباتی پن میں جو کچھ کر چکی تھی اس کی سزا بھی پا چکی تھی۔ اس کا ذہن چوٹوں سے لہولہان تھا۔ اب تو دل و دماغ کا کوئی خفیہ گوشہ بھی ایسا نہ رہا تھا جن سے خون کی بوندیں بہہ نہ رہی ہوں۔

بچّی کی جدائی میں تو اک عرصے سے تڑپ رہی تھی۔ لیکن اب اس کا حلیہ دیکھا تو کلیجہ شق ہو گیا۔ بن ماں کے بچی کا یہ حال نہ ہوگا۔ تو کیا ہوگا۔ وہ گھنگریالے بال، وہ معصوم سا سرخ و سپید چہرہ ـــــ وہ گول مٹول سی بچّی ـــــ سب کچھ بدل گیا تھا ـــــ شبو نے اس کے چہرے پر محرومیت کے واضح سایے دیکھے تھے ـــــ اس کا دل خون بن کر آنکھوں کے راستے ٹپک رہا تھا۔

تمام رات اس نے آنکھوں میں گزار دی۔ کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وسیم اور لبنیٰ ہی اس کی زندگی کا محور ہیں۔ وسیم کی مامتا وہ پتھر کی سلوں تلے دبا سکتی تھی ـــــ لیکن لبنیٰ اُف ـــــ وہ ممتا کے اُن

لاشوں کا کیا کرتی۔ جو وقت کی سلوں تلے سے اُبھر اُبھر کر باہر آ رہے تھے۔

وہ تین چار یوم اپنے آپ میں کھوئی رہی ——— پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر وسیم کے پاس جا کر بچی کو ملنے کا فیصلہ۔

بڑے عزم کے ساتھ وہ تیار ہوئی۔ اطمینان و سکون کا لبادہ بڑا ازبر نظر تھا۔

وہ ہسپتال پہنچی۔ لیکن اس کی مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ جب اسے پتہ چلا کہ وسیم ڈسچارج ہو کر چلا گیا ہے۔

اس دن اس پر مجنونانہ سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے یوں لگا جیسے کشتی کنارے پر آ کر ڈوب گئی ہو ——— ساری رات اس نے مضطربانہ ٹہلتے رو رو کر ہلکان ہوتے ——— اور لبنیٰ لبنیٰ چیختے گزار دی۔

دن نکلا۔ اسے سکون نہ ملا ——— دن بھی تڑپتے گزرا۔

تین چار دن یونہی گزر گئے۔

اسے کسی کل چین نہ آتا۔ وہ سایوں کے تعاقب میں دوڑ پڑتی ——— تکیہ سینہ سے لگا کر لبنیٰ لبنیٰ پکارتی ———

اور پھر ——— ایک بار پھر اس نے سنبھالا لیا۔ سارے واقعات کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ لبنیٰ کے لیے ممتا کی طلب اس حد تک بڑھ چکی تھی۔ کہ وہ ہر تباہی کو بھی گلے لگانے پر آمادہ ہو گئی۔

کئی دنوں کے کاروباری دورے کے بعد نواز واپس آیا تو اسے شبو کافی کمزور لگی ———

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ بیمار رہی ہو کیا؟" اس نے بیتابی سے پوچھا۔

"جی"

"مجھے اطلاع کر دی ہوتی ———"

"اس کی ضرورت نہ تھی۔ یہ تو روز روز کی بات ہے ———"

"اب کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک ہوں"

نواز مطمئن ہو کر اپنے کاروباری اُمور سلجھانے میں لگ گیا۔

دوسرے دن اسے وسیم کا خیال آیا۔ پانچ بجے کے قریب وہ ہسپتال جانے کو تیار تھا۔

"کہاں جا رہے ہیں ———" شبّو نے پُوچھا۔

"ہسپتال ——— ذرا وسیم صاحب کا پتہ کر لیں ———" نواز نے کہا

"میں بھی چلتی ہوں" وہ جلدی سے بولی۔

شبّو جانتی تھی کہ وسیم وہاں نہیں ہے۔ لیکن وہ اس کا کھوج لگانے کے لیے وسیلہ ڈھونڈ رہی تھی۔

"تم نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے" نواز مسکرایا۔

"کیوں؟" وہ بُرا مان گئی۔

"پھر وہاں دورہ پڑ گیا تو ———؟"

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔ جیسے میں جان بُوجھ کر کرتی ہُوں"

"نہیں نہیں ——— چلو تیار ہو جاؤ"

شبو نے تیار کیا ہوتا تو اسی طرح ساتھ چل دی۔

کمرہ نمبر آٹھ میں کوئی اور مریض تھا۔

نواز کو اس کے چلے جانے کا افسوس ہوا۔

"آپ کو ان کا گھر معلوم نہیں —" شبو نے رکتے رکتے پوچھا۔

"نہیں —"

"دفتر —؟"

"ہاں دفتر کا پتہ ہے"

"وہیں سے گھر کا پتہ مل جائے گا —"

"ہاں"

شبو کو جیسے اندھیرے راستوں پر روشنی کی کرن نظر آ گئی۔

"کل ہی پتہ کرتا ہوں — اس شریف آدمی کا شکریہ تو ادا کر
دیں — میرا خیال تھا کہ ہسپتال کا خرچہ دے دوں گا — غیر حاضری
میں ہی ڈسچارج ہو گیا —"

"گھر کا پتہ لگائیں — پھر جو کرنا ہو گا کریں گے" شبو کا لہجہ فیصلہ کن
تھا —

نواز نے دوسرے ہی دن پتہ کر لیا۔

اور

شام شبو کو ساتھ لے کر وہ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔

شبو نے محسوسات کے جلتے جلتے شراروں پر برف کی موٹی موٹی

تہیں جمالی تھیں۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ وسیم کے ہاں جا رہی تھی۔ جانے
اس نے ذہن میں کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔

نئی آبادی کے اس محلے کی گلیاں کشادہ تھیں۔ موٹر یک منزلہ اڈرنما
مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔

نواز نے دو تین دفعہ ہارن بجایا۔

شبو بظاہر سکون اور دلجمعی سے بیٹھی رہی۔

بوڑھی ملازمہ نے دروازہ کھولا — شبو نے جلدی سے منہ
دوسری طرف کر لیا۔

"وسیم صاحب ہیں گھر پر؟"

"جی"

"ہمارے آنے کی اطلاع کر دو"

"کیا کہوں صاحب؟"

"نواز آئے ہیں"

"اچھا —"

ملازمہ چلی گئی — کچھ ہی دیر بعد ساتھ والا دروازہ کھلا۔ یہ بیرونی کمرہ
اس گھر کی بیٹھک تھی۔

"آؤ" نواز موٹر سے نکلتے ہوئے شبو کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

شبو کے چہرے کا رنگ شاید متغیر تھا۔ وہ سحر زدہ سی باہر نکلی۔

"دوسرے کی تیاری تو نہیں کر رہیں" نواز پھر مسکرایا۔

"نہیں" شنو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

دونوں بیٹھک میں داخل ہو گئے۔

شنو کا دماغ بُری طرح چکرایا۔

کتنا مانوس تھا یہ کمرہ اور کمرے کی فضا ——

وہی لہریو دار پردے —— وہی پرانی طرز کا صوفہ —— بائیں ہاتھ کونے میں رکھا ہُوا اونچا سا لیمپ —— میز پر اس کے ہاتھوں سے کڑھے ہوئے پھولوں والا رومال —— چھوٹا سا لال قالین —— جو اس نے زائد آمدنی جمع کر کے خریدا تھا۔ مینٹل پیس پر رکھی ہوئی ممی کی وہی تصویر —— جو انھوں نے اس کی پہلی سالگرہ پر کھنچوائی تھی۔

لاکھ جی کڑا کیا —— لیکن ریت کی دیواریں پانی کے ریلے کے سامنے کیسے ٹھہرتیں —— اس کا جی چاہا —— اک اک چیز سے لپٹ کر چیخ چیخ کر روئے۔

کانپتے وجود اور فق چہرے کو لیے وہ کونے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

یہاں نسبتاً اندھیرا تھا —— اور شنو کے چہرے کی ہیجانی کیفیتوں کے ظاہر ہونے کا امکان ذرا کم ——

نواز صوفے پر بیٹھ کر سگار سلگانے لگا۔

اندرونی دروازہ کھُلا ——

اور

وسیم اندر داخل ہُوا —— اس کی پہلی نظر شنو پر پڑی۔

نواز مسکراتے ہوئے گرم جوشی سے مصافحے کے لیے اٹھا۔"

"کیا حال ہے وسیم صاحب! آپ تو ہسپتال سے غائب ہی ہو گئے لیکن دیکھئے ہم نے پتہ نکال ہی لیا آپ کا ——"

وسیم کا رنگ زرد سے کہیں زیادہ اُترا اُترا سا تھا —— نواز کے جواب میں وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

مسکرانا تو وہ بھول ہی چکا تھا۔

شنو اپنی حالت پر قابو پا چکی تھی —— وہ گلدان سے سوکھی پتیاں نوچ نوچ کر پھینک رہی تھی۔

"میں کاروبار کے سلسلے میں باہر چلا گیا تھا ——" نواز نے کھڑے کھڑے کہا —— وسیم اسے بیٹھنے کا بھی نہ کہہ سکا۔

"واپس آتے ہی آپ کو دیکھنے گیا۔ لیکن معلوم ہُوا۔ آپ ڈسچارج ہو گئے ہیں ——"

"جی" اس کا مختصر سا جواب تھا۔

نواز نے سگار کا کش لیا۔

"بیٹھئے ——" وسیم جیسے انتہائی ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔

لیکن بیٹھنے سے پہلے ہی زور زور کا ہارن ہُوا۔

وسیم نے دروازے میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا۔ کوئی جیپ تھی۔

لیکن موٹر کھڑی ہونے کی وجہ سے راستہ نہیں تھا۔

وسیم کو دیکھ کر جیپ سوار نے اشارہ سے راستہ دینے کو کہا۔

"کیا بات ہے؟" نواز اس کے قریب آکر بولا۔
"گاڑی سے راستہ رک گیا ہے ــــ جیپ نے آگے جانا ہے ــــ"

"پھر ــــ"

"تھوڑا سا آگے لے جانا پڑے گی گاڑی ــــ وہاں میدان صاف ہے۔

اچھا ــــ میں وہاں لے جاتا ہوں"
"آپ کو تکلیف ہوئی نواز صاحب ــــ لیکن کیا کیا جائے۔ یہ گلیاں موڑوں کے لیے سازگار نہیں ــــ

نواز اسے وسیم کی کسر نفسی سمجھ کر مسکرایا ــــ اور گاڑی کی طرف چلا گیا ــــ وسیم مڑا۔

اور اندرونی دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ تقدیر نے جہاں بھر کے عذابوں کے لیے اسے ہی کیوں چن لیا ہے۔

کمرے میں جان لیوا سی خاموشی تھی ــــ برقی تیز لہر کی طرح یہ خاموشی دونوں کے رگ و پے میں تیر رہی تھی۔

وسیم نے سر اٹھا کر شبو کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کی لرزش کسی بات کو ترتیب دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پچھلا دروازہ کھلا اور لبنیٰ اٹھلاتی ہوئی اندر آئی۔

لیکن

دوسرے ہی لمحہ جیسے کسی نے متحرک گڑیا کو جادو کے ذریعہ ساکت کر دیا ہو۔

اس کی نظریں شبو پر پڑیں۔
حیرت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔
اک لمحہ کا سکتہ

اور

پھر
معصوم آنکھیں مسرت سے چمکیں ــــ دھندلائیں اور وہ بے تابی سے چیخ اٹھی۔

"امی ــــ!"
شبو پانی کے ریلے کی طرح اس کی طرف بڑھی ــــ بازو پھیلائے ہوئے بڑھی۔ لیکن شبو کے پھیلے بازوؤں میں پہنچنے سے پہلے ہی برق کی سی تیزی سے وسیم نے بچی کو اچک لیا۔
"لبنیٰ ــــ!" وہ گرجا ــــ
"ابو ــــ امی ــــ!" لبنیٰ نے بھرپور خوشی سے جیسے انکشاف کیا ــــ

وسیم نے اس کے منہ سے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سختی سے بازوؤں میں سمیٹتا ہوا پچھلے دروازے کی طرف بڑھا۔
"امی ــــ!" لبنیٰ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر چیخ ماری ــــ لیکن

وسیم پاگلوں کی طرح اسے ہاتھوں میں اُٹھائے کمرے سے نکل گیا۔
اس نے کھٹاک سے دروازہ بند کرکے کُنڈی بھی لگا دی۔
"لبنیٰ" — شبو چلّائی۔
"امّی — امّی — دوسری طرف سے لبنیٰ مُرغِ بسمل کی طرح
تڑپی۔
"چُپ ہو جاؤ لبنیٰ — وہ تمھاری امّی نہیں — وہ کسی کی ممی ہو
سکتی ہے۔ تمھاری امّی — نہیں — نہیں ہو سکتی — تمھاری امّی
نہیں ہو سکتی۔" دیوانوں کی طرح وسیم چیخ رہا تھا۔
بچّی بے تابانہ تڑپتے ہوئے ماں ماں پکار رہی تھی۔ وسیم نے
اسے ڈانٹا — وہ چُپ نہ ہوئی۔
"تڑاخ — تڑاخ —" وسیم نے اس کے منہ پر زور زور
سے طمانچے مارے — شبو تڑپ گئی — اس نے دروازہ پیٹ ڈالا
— چلّاتے چلّاتے اس کا حلق خشک ہو گیا۔
اور
جب نواز موٹر آگے لے جا کر میدان میں کھڑی کرکے واپس آیا۔ تو شبو
صوفے کے قریب نیم بے ہوش پڑی تھی۔
"کیا مصیبت ہے،" وہ جھلا کر بُڑبڑایا۔
اندر سے بچّی کے مسلسل رونے کی آواز آ رہی تھی۔ جسے شاید ملازمہ
چُپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

نواز نے شبو کو پُکارا — شبو نے جان کنی کے سے عالم میں نواز
کو دیکھا۔
"کیا ہو گیا —؟" وہ برہم نظر آ رہا تھا — "اتنا بھی قابو نہیں رہتا
جہاں جاتی ہو پریشان ہی کرتی ہو —؟"
پھر اس نے دروازہ کھٹ کھٹایا —
"وسیم صاحب — وسیم صاحب —؟"
"وسیم پتھرائی ہوئی لاش کی طرح اندر آیا — وہ سرتاپا بدلا ہوا تھا"
"ذرا پانی کا ایک گلاس —" نواز نے کہا۔ وسیم اندر چلا گیا۔
بچّی اب بھی رو رہی تھی — وسیم نے کرخت لہجے میں اسے
ڈانٹا —
پانی لے کر واپس آیا۔ تو شبو صوفے پر بیٹھی تھی۔
"آپ کا بچّہ رو رہا ہے شاید" نواز پانی پیتے ہوئے بولا۔
بچّی اب بھی چیخ رہی تھی۔ شبو نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔
نواز کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے — شبو کی مجنونانہ بے تابیوں
کا سرا جیسے اسے مل گیا۔ روتے بچّے کو دیکھ کر شاید اسے اپنی بچی یاد آ گئی۔
نواز نے تلخی سے سوچا۔
"کوئی تکلیف ہے بچّے کو" نواز وسیم کو دیکھ کر بولا۔
"ایسی تکلیف جسے رفع کرنا میرے بس میں نہیں —" وسیم
بُڑبڑایا۔

نواز نے غور سے اسے دیکھا — استفہامیہ نظریں وسیم سے جواب کی طلب گار تھیں۔ "ہر ایسی عورت کو دیکھ کر" وسیم نے شبو کی طرف اشارہ کیا "ماں ماں پکار اٹھتی ہے — یہ بھی کوئی بات ہے بھلا — کوئی —"

وسیم ہاتھ مسلتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ کر ہی چپ ہو گیا۔

"اوہ —" نواز نے شبو کی طرف دیکھا — جس کا سر صوفے کی پشت پر تھا۔ آنکھیں بند اور پیشانی پہ پسینے کے قطرے تھے۔

نواز کے ذہن میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو گئیں۔ شبو کے جنونی دوروں کے پسِ پردہ چھوڑی ہوئی بچی کارفرما تھی۔

ہمدردی کی بجائے اسے غصہ آگیا۔ اس احساس سے اس نے گھٹن سی محسوس کی — رقیبانہ جذبہ ابھرا۔ اس کا موڈ یک لخت خراب ہو گیا۔

وسیم سے معذرت کرتے ہوئے اس نے شبو کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔

اس کا مزاج درہم برہم تھا۔ فضا بڑی ناگوار سی تھی — جبری طور پہ مسکراتے ہوئے اس نے وسیم سے مصافحہ کیا۔ اور شبو کا بازو تھام کر اسے باہر لے گیا۔ شبو اب بھی نیم بے ہوش تھی ٭

شبو نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں — اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

"لبنیٰ" وہ چیخی — "میری بچی —!"

پلنگ سے اتر کر وہ دروازے کی طرف دوڑی۔

نواز بھنایا سا کرسی پر بیٹھا — اس کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔

شام سے رات ہو چکی تھی۔ شبو کی مجنونانہ حرکتوں میں کمی نہ آئی تھی۔

کبھی وہ زور زور سے رونے لگتی۔

کبھی لبنیٰ لبنیٰ پکارتی۔

وہ تڑپ رہی تھی۔

اور

نواز اس تڑپ سے کھول رہا تھا۔ ان دیکھی بچی کے لئے تنفر کا جذبہ بڑھ رہا تھا۔ اس بچی کی خاطر وہ اس کی زندگی اجیرن کیے ہوئے تھی۔

نواز اب تک بے خبر تھا۔ کہ وسیم ہی کی بچی شبو کی بچی ہے —
اسے یہ علم ہو جاتا تو جانے وہ کیا کر بیٹھتا —
شبو سسک سسک کر رونے لگی۔
"شبو —" جذبات سے عاری آواز میں نواز نے اسے پکارا۔
پھر قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"شبو —!"
شبو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں شعلے بھڑک کے
دانت پیستے ہوئے اس نے نواز کا کالر جھپٹ کر پکڑ لیا۔
"تم — تم ظالم ہو — تم نے ہی میری لبنیٰ کو مجھ سے جُدا
کیا — کم ظرف — تنگ نظر — ظالم —" وہ کہتی گئی۔
نواز بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔
"میری بچی مجھے واپس لادو — واپس لادو — ورنہ —
ورنہ —" وہ زور زور سے رونے لگی۔
نواز اپنی اہانت پر تلملا اٹھا — "بدتمیز عورت —"
"میں اپنی بچی کو لے آؤں گی — لے آؤں گی — دیکھوں
گی تم کیا کر لیتے ہو میرا —" وُہ جنونی انداز میں کہے گی۔
"بچی — بچی —" وہ دانت پیستے ہوئے غرّایا۔ "یہ
آئے دن کے سوانگ اسی لیے رچاتی رہی ہو — تمھاری بچی نے اس
گھر میں قدم رکھا — تو ٹکڑے اڑا دوں گا — سمجھیں — اتنی ہی عزیز

ہے۔ تو اس کے پاس دفع ہو جاؤ — زندگی اجیرن کر دی میری بھی —"
وہ بک بک کرتا کمرے سے نکل گیا۔
شبو بڑی دیر تک بیٹھی روتی رہی۔
نواز اس رات خواب گاہ میں سونے کے لیے نہیں آیا۔ شبو نے
پروا نہیں کی — وہ تو لبنیٰ کے متعلق ہی سوچتی رہی۔
لبنیٰ
جس کے لیے اب وہ ہر تباہی کو گلے لگانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔
صبح ہی صبح وہ بستر سے اٹھی۔ رات کے مضمحل اور بے قرار لمحوں
میں وہ اک عزم کر چکی تھی — اور آج اس عزم پر اس نے عمل پیرا ہونا تھا۔

"امّی ---- امّ ---- ی ---- ام ---- ی ----" للّنی نیند میں چیخی۔

وسیم نے اس کی کروٹ بدلی ---- اسے سینے سے لپٹا کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ بچی کو تیز بخار تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ کمرے میں بتی روشن تھی۔ للّنی وسیم کے سینے کے ساتھ لگی سسک رہی تھی۔ وسیم منہ سے کچھ نہیں بولا ---- لیٹے لیٹے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

بچی سسک سسک کر پھر سو گئی ---- بخار کی حدت سے جلتے ہوئے وجود سے وسیم کا سینہ جلنے لگا۔ اس نے آہستگی سے اسے الگ کیا۔ تکیہ سر کے نیچے ٹھیک کرتے ہوئے وہ اٹھا ---- اور ساتھ والے خالی پلنگ پر لیٹ کر سگریٹ سلگا لیا۔

رات بچی کا سر سہلاتے اور سگریٹ پھونکتے گزر رہی تھی۔ وسیم

کا کمزور جسم تھکن سے چور چور تھا۔ اور اس کا ذہن ---- جسم سے کہیں زیادہ نڈھال، پژمردہ ---- اور چور چور ----

للّنی نے کل اچانک ماں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی تشنگی مٹانے کو ماں کی طرف لپکی تھی ---- لیکن وسیم نے سیراب ہونے سے پہلے ہی اسے اچک لیا تھا۔ بچی ان وجوہ کو کیسے جان لیتی ---- جن کی بنا پر وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ وہ تو تشنہ تھی۔ پانی کو دیکھ کر تڑپ اٹھی تھی۔

وسیم نے اپنا غصّہ اس پر اتارا تھا۔ تھپیڑ بھی مارے۔ ننھے تشنگی کے احساس کے ساتھ خوف و ہراس بھی شامل ہو گیا ---- بچّی کے ذہن پر بُرا اثر پڑا۔ وہ روتے روتے سو گئی ---- اور سوتے میں بخار ہو گیا۔

بخار کی غنودگی میں وہ بار بار "امّی ---- امّی ---- پکار اٹھتی۔

بچی تو بلک بلک کر سو گئی لیکن وسیم کے لیے اک اک لمحہ دہکتا ہوا انگارہ بنا جا رہا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ اپنے ماضی میں ڈوبا جا رہا تھا ---- زندگی نے اسے دکھ درد کے سوا کیا دیا تھا ---- بچپن ہی سے وہ حیات کی نوازشوں سے محروم تھا۔ ماں نے بڑی ہمت کر کے اسے سہارا دیا تھا۔ اس سہارے سے اس نے دکھوں کو پچھاڑ پھینکا تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ زندگی ڈھنگ سے گزارنے کے ذریعے ڈھونڈ کر وہ کتنا مطمئن ہو گیا تھا ---- پھر شیوا اس کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔ پوری رعنائیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ ---- چار سال بہاروں کے جھومتے نظارے کرتے گزرے ---- اور پھر ----

پھر
خزاں آگئی — اُف دکھ درد کے ان دنوں کا تصوّر بھی کھولتا ہوا عذاب تھا۔
اسے کئی واقعات یاد آ رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بے تابانہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔
"یا خدا!" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔
اس عذاب سے بھی وہ شاید نپٹ لیتا۔ لیکن اب شبو نے ایک بار پھر اس کی زندگی کی بنیادوں کو ہلا ڈالا تھا۔
تقدیر اس کے ساتھ کتنے بے رحم روح فرسا اور جان لیوا مذاق کر رہی تھی۔
"امّی —" لبنیٰ پھر چیخی۔
سگریٹ پھینک کر اس نے اپنے دکھ سینے ہی میں سمیٹ لیے۔
پلنگ کی پٹی پہ بیٹھتے ہوئے وہ بچی پر جھک گیا۔
لبنیٰ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔
"میری بچی" وہ کچھ اور جھکا — بخار تشویش ناک صورت اختیار کر رہا تھا۔ وہ پریشان نظروں سے بچی کو دیکھنے لگا۔
لبنیٰ ٹکر ٹکر اسے دیکھے گئی۔
وہ اس کے ماتھے پر شفقت سے ہونٹ رکھنے کو جھکا۔
لیکن

"لبنیٰ"
لبنیٰ نے زور سے چیخ ماری — اس کا چھوٹا سا وجود تھر تھر کانپنے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنے گال چھپا لیے — سہمی ہوئی نظروں سے باپ کو دیکھنے لگی۔
"میری بچی" اس نے چمکارا۔
لبنیٰ کی ہراساں نظریں اب بھی اس کے چہرے پر تھیں۔
"لبنیٰ!" وہ پھر جھکا۔
"ابو — نہ مارو — ابو — میں امّی — نہیں کہوں گی — امّی — نہیں کہوں گی — نہ مارو — ابو —"
"لبنیٰ!" وہ تڑپ اٹھا — بے تابی سے بچی کو سینے سے لگا لیا — ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ اپنا درد چھپانے لگا۔
بچی تھر تھر کانپتے ہوئے وہی الفاظ دہرا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں کل تھپڑ کھانے کا خوف عود کر رہا تھا۔
بے کل وسیم کچھ سمجھ نہ پایا تھا۔ کہ بچی کی تسکین کے لیے کیا کہے۔
اس کا دل خون ہوا جا رہا تھا۔
"لبنیٰ" وہ اسے سینے سے بھینچے بولا "کانپ کیوں رہی ہو — ہاں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا — میں ابو ہوں تمھارا — میری طرف دیکھو — میری بیٹی — میرا سینہ پھٹ جاتے گا لبنیٰ — اتنے دکھ کیسے سہار لوں —"

بچی پسینے سے شرابور ہو گئی — وہ باپ کی چھاتی سے لگی کانپتی رہی۔

بڑی مشکلوں سے اس نے بچی کا دھیان دوسری طرف ہٹایا — بستر پہ لٹا کر سر سہلایا — گڑیا دکھائی — پلاسٹک کا ٹی سیٹ دیا — بچی کا دھیان کچھ بٹ گیا لیکن وہ زیادہ دیر ادھر متوجہ نہ رہ سکی۔

"دودھ پیو گی؟"

"ہاں"

وسیم نے پیالی میں دودھ لا کر اسے پلایا۔

"اب سو جاؤ۔"

وہ لیٹ گئی۔

وسیم پٹی پہ بیٹھ کر اس کا سر سہلانے لگا۔

"صبح اٹھو گی تو ڈھیر سی چیزیں لا کر دوں گا۔"

"کھلونے"

"ہاں ہاں کھلونے — ٹافیاں — فراک"

"ربن بھی۔"

"ہاں ہاں بہت سے ربن — ہر رنگ کے۔"

"ڈیگچی بھی لوں گی ابو —"

"کیوں نہیں۔ سب کچھ لے کر دوں گا اپنی منی سی بیٹی کو — اچھا — اب سو جاؤ — میں بھی سوتا ہوں۔"

وہ اس کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔

وہ کروٹ کے بل کچھ دیر پڑی رہی۔

"ابو —" اس نے چہرہ وسیم کی طرف کر لیا۔

"ہوں"

"میں گڑیا سے کھیلا کروں گی — امی کو — بالکل یاد نہیں کروں گی —" وہ جیسے رو دینے کو تھی۔

وسیم نے بڑے کرب سے اسے دیکھا۔

"لبنیٰ" اس نے پیار سے اس کا گال تھپ تھپایا — "بیٹا اب سو جاؤ —"

لبنیٰ نے بڑے معصوم انداز سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن وسیم نے دیکھا اس کی بند بند آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔

وسیم کے سینے میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

آنکھوں کے گوشوں کی نمی موٹے موٹے آنسوؤں میں ڈھل گئی۔

"ابو —" وہ سسک اٹھی۔

"لبنیٰ" وسیم نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"ابو —" وہ بے اختیار ہو کر رو دی۔

بچی ہی تھی نا — حالات کی تلخی اور بے رحمی کا اندازہ اسے کیونکر ہوتا۔ بچہ تو کھلونا پا کر کھو دے تو تڑپ اٹھتا ہے — اس نے تو ماں کو پا کر کھویا تھا۔

وسیم کے پاس تو اب تسلی و تشفی کے لیے الفاظ بھی نہ رہے تھے۔

خاموشی سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا رہا۔

کرب سے اسے دیکھتا رہا۔

بچی کے گالوں پہ آنسوؤں کی لکیریں بن بن کر پھیلتی رہیں۔

دن کافی نکل آیا تھا۔

لیکن لبنیٰ ابھی تک بے سُدھ پڑی تھی۔

وسیم نے اس کی پیشانی چھُوئی اور پھر نبض پہ ہاتھ رکھ دیا۔ بُخار تشویش ناک حد تک تیز تھا۔

"بیٹے آنکھیں کھولو نا" — وسیم نے جھک کر پیار سے کہا۔

"اوں" — لبنیٰ نے پلکیں جھپکا کر پھر بند کر لیں۔ اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔ آنکھیں انگارہ سی تھیں — غنودگی طاری تھی — وسیم نے اس کے ننھے سے ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیے۔

ملازمہ چائے کی پیالی ہاتھ میں پکڑے اندر آئی۔

"کیا حال ہے اب؟" اس نے پیالی وسیم کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"بخار بہت تیز ہے۔" وہ فکرمند لہجے میں بولا۔ اس نے چائے میز

پر رکھ دی۔

"کسی ڈاکٹر کو دکھا دو۔"

"ڈاکٹر کو یہاں بلاتا ہوں —— باہر لے جانے سے ہوا نہ لگ جائے ——"

"تم نے بھی تو کل حد کر دی بیٹے —— معصوم بچی کیا جانے ؟ —— مل لینے دیا ہوتا ماں سے ——"

وسیم سر جھکائے دانتوں سے اپنے ناخن کاٹتا رہا —— اس نے کیا کیا تھا —— یہ وہ جانتا تھا۔ لیکن ایسا کرنا مناسب بھی تھا؟ وہ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکا۔

"تم اس کا بستر ٹھیک کر دو —— میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔"

"بہت اچھا، یہ چائے تو پی لو ——!"

وسیم نے دو تین گھونٹ حلق میں انڈیلے —— اور پھر ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار ہونے لگا۔

ملازمہ بے ترتیب اور الٹ پلٹ کمرے کو ٹھیک کرنے لگی۔

"اس کا فراک بھی بدلانا ہے —— رات دودھ گر گیا تھا۔"

"تم ڈاکٹر کی طرف جاؤ —— میں سب کچھ کر لوں گی —— بخار تو بہت تیز ہے —— ہائے ہائے جل گئی میری بچی ——" ملازمہ نے پیار سے بے سدھ لبنیٰ کی پیشانی چوم لی۔

وسیم کھونٹی سے کپڑے اتار کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔

کھٹ —— کھٹ —— کھٹ۔ کسی نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔

"کون ہے" ملازمہ کمرے ہی سے پکاری۔

دستک پھر ہوئی —— وسیم کا دل زور سے دھڑکا —— دستک کا انداز مانوس سا تھا۔

ملازمہ ہاتھ میں جھاڑن لیے کمرے سے نکل اور چھجے سے صحن میں آگئی۔

وسیم لپک کر آیا۔

"تم بیٹھو لبنیٰ کے پاس —— میں باہر دیکھتا ہوں۔"

ملازمہ چلی گئی —— دستک پھر ہوئی۔

وسیم ڈیوڑھی کی طرف گیا —— دستک کا انداز جانا پہچانا تھا۔

وہ ایک دم دروازہ نہ کھول سکا۔ دروازے کی درز سے دیکھا۔

کالی موٹر کا پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ وسیم کا شک درست نکلا وہ شبو ہی تھی۔

وہ تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ دروازہ کھول دے۔ یا اسے باہر ہی سے واپس کر دے؟ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

شبو نے اس بار دروازہ زور سے پیٹا۔

وسیم دروازہ کھولنے کی بجائے بیٹھک میں گیا اور اس کا بیرونی دروازہ کھول دیا۔

شبو دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اسی طرف آ گئی۔

وسیم پٹ سے لگا کھڑا تھا۔ رات بھر کی ذہنی پریشانی اور الجھن سے خاصہ نڈھال ہو رہا تھا۔

شبو نے اسے دیکھا —— اور بغیر کچھ کہے اندر آ گئی —— کالی شال میں اس کا سپاٹ اور ویران چہرہ مضمحل لگ رہا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی

تھیں — بال بے ترتیب تھے۔

وسیم نے مڑ کر اسے دیکھا — وہ کمرے کے وسط میں پہنچ چکی تھی۔
برق کی سی تیزی سے بڑھ کر وسیم نے صحن میں کھلنے والا دروازہ
بند کر لیا۔ شبو کا ارادہ وہ بھانپ گیا تھا۔ بند پٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"میں لبنیٰ کو دیکھنے آئی ہوں —" وہ جیسے عالمِ نزع میں تھی۔

"میں سمجھ گیا ہوں" وسیم آہنی لہجے میں بولا —

"دروازہ کھول دیں —" وہ نیچی نظریں کیئے مری مری آواز میں بولی۔

"یہ دروازے تم اپنے ہاتھوں بند کر چکی ہو — بچی سے تم نہیں
مل سکتیں —" اٹل لہجہ تھا۔

"صرف ایک بار دیکھ لینے دیں —" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"ناممکن —" وہی اٹل اور آہنی آواز تھی۔

"وسیم —" بھرائی ہوئی آواز پھٹ گئی۔ شبو کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔
لہجے کی گرمی اور حرارت سے وسیم کا وجود پگھل گیا — اُف! یہ
مانوس لہجہ — وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے شبو کی طرف دیکھنے لگا۔
شبو جو کبھی اس کی بیوی تھی۔ لیکن اب! اتنے قریب کھڑے ہونے
کے باوجود وہ ابد کا سرا تھی۔

"اتنے ظالم نہ بنو وسیم — ہر لغزش کے باوجود میں اسے بچی کہنے
کا حق رکھتی ہوں" وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

وسیم کا پارہ ایک دم چڑھ گیا — ظلموں کی انتہا کے بعد بھی وہ
اسے ظالم کہہ رہی تھی — اس کا چہرہ سرخ ہو گیا — الجھے الجھے بال
ماتھے پر جھک آئے — وہ خوفناک نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

"مجھے اس سے ملنے دو — میرے کانوں میں اس کی چیخیں گونج
رہی ہیں — میں اس کی ماں —"

"ماں —" اس نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی — "ماں کہنے
سے اچھا تھا کہیں ڈوب مرتیں —"

فرطِ غیظ سے وسیم کا سانس الجھنے لگا — شبو روتی رہی۔
وہ ہاتھ ملتے ہونٹ کاٹتے۔ پلکیں جھپکاتے اپنے جذبات —
مشتعل جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔

"صرف ایک بار اپنی بچی کو — دیکھنا چاہتی ہوں —" وہ
ہچکیوں کے درمیان کہنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر وسیم کے سامنے کر دیئے
وسیم نے ان قریب آتے ہاتھوں کو پوری قوت سے پرے ہٹا دیا،
الٹے ہاتھ کے طمانچے سے شبو کے ہاتھ سرخ ہو گئے۔

"وسیم —" شبو روتے روتے جھکی — اور دوسرے لمحے
اس نے اس کے پاؤں پکڑ لیئے — "جتنا جی چاہے مار لو —
لیکن للہ میری خطا — بخش دو — وسیم — معاف — کر دو
گناہگار — کو معاف کر دو —"

وسیم گنگ سا رہ گیا — ہلنے جُلنے کی طاقت ہی نہ رہی جیسے۔
مٹی کے بُت کی طرح دروازے کے سہارے کھڑا رہا۔

"مجھے ایک بار لبنیٰ سے مل لینے دو — میرا دل تڑپ رہا ہے
وسیم — مجھ پر رحم کھاؤ —" اس نے بھیگی آنکھوں سے وسیم کو دیکھا

"رحم —" وسیم کے بدن میں آگ لگ گئی — "رحم کے لفظ

سے تمہارے ہونٹ بھی آشنا ہیں ۔۔۔" اس نے پاؤں اک جھٹکے سے
شبو کے ہاتھوں سے چھڑا لیے۔

"میں اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہوں ۔۔۔ وسیم ۔۔۔ شدید
سزا ۔۔۔" وہ اُٹھ کر اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

وسیم نے اسے دیکھا۔ وہ اسے درد کی ایسی لہر لگی۔ جو دِل کی
گہرائیوں سے اٹھتی اور رُوح کی وسعتوں پر پھیل جاتی ہے ۔۔۔ لیکن اس
احساس کو اس نے سر جھٹک کر ذہن سے نکال دیا۔

شبو کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اور دھندلائی آنکھیں اس کے
سامنے تھیں۔

"وسیم" ۔۔۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجسم التجا بن
گئی۔ اس نے ہاتھ پھر باندھ دیئے۔

وسیم کے لیے یہ لمحات کسی آزمائش سے کم نہ تھے۔ لیکن
وہ سنبھل گیا۔ شبو اس کے اور قریب آ گئی ۔۔۔ "مجھے اندر جانے دو"

"نہیں ۔۔۔" وسیم نے بازو سے اسے پرے دھکیل دو ۔۔۔
دھکا کھا کر شبو لہرائی لیکن گرنے سے بچ گئی۔ وہ آگے کو لپکی۔
اور ۔۔۔ سنبھلنے کی کوشش میں
جانے کیسے وہ وسیم کی چوڑی چھاتی سے آ لگی۔

"اُف ۔۔۔" وسیم تلملا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کی
ننگی چھاتی پر انگارے ہی انگارے بکھیر دیئے ہوں۔ اذیت سے وہ تڑپ گیا۔
شبو اس کی قمیص دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑے چھاتی

میں سر چھپائے رو رہی تھی۔ وہ یوں مچل گئی تھی۔ جیسے اس چھاتی کی بیکراں
وسعتوں میں ڈوب جانا چاہتی ہو۔

اک لمحہ کو وہ سب کچھ بھول گیا۔
اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔
اس کا جسم بھُر بھُری مٹی کا بن گیا۔
اس کے ہاتھ ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح لٹک گئے۔

چند ثانیوں کا سکتہ سالوں پر محیط معلوم ہُوا۔
شبو کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں۔
وسیم کے ٹوٹی شاخوں کی طرح لٹکتے ہاتھ اُٹھے۔
اس نے ہاتھ شبو کے کندھوں پر رکھ دیئے۔
شبو نے قمیص پر گرفت اور مضبوط کر دی۔ اس کے آنسو اور
تیزی سے بہنے لگے۔ وسیم نے اس کے کندھے پکڑ کر اسے چھاتی سے جدا کیا۔
شبو کا جھکا ہُوا سر اٹھا۔
بھیگی آنکھیں وسیم کی آنکھوں سے ملیں۔
وسیم چند لمحے ۔۔۔ صرف چند لمحے اس کی آنکھوں میں جانے کیا دیکھتا رہا۔
پھر ۔۔۔ پھر ۔۔۔ اس نے پوری قوت سے شبو کو جھٹک کر
پیچھے دھکیل دیا ہے "بے وفا ۔۔۔"

اس نے اسے یوں پرے پھینکا جیسے وہ کوئی ڈنک مارنے والا
زہریلا کیڑا تھی۔ شبو میز کے کنارے پر گری۔ لیکن چوٹیں سہنے کی عادی ہو
چکی تھی۔ اُٹھ کر پھر وسیم کے قدموں سے لپٹ گئی۔ وسیم غصے سے بے قابو ہو گیا۔
"مجھے ان قدموں سے جدا نہ کرو وسیم ۔۔۔ جتنی کڑی چاہے سزا

دے لو۔ لیکن — ایک بار — ایک بار — ان قدموں میں آنے کی اجازت دے دو میں سب کچھ چھوڑ کر تمھارے پاس آنے کو تیار ہوں مجھے قبول کر لو۔"

"تم خاوند بدلنے کی عادی ہو چکی ہو —" وسیم نے اسے ٹھوکر ماری "لیکن میں ایسی کوئی عادت نہ اپنا سکا —"

"وسیم —" شبو چیخی — اس اہانت پر اس کی نسائیت تڑپ گئی۔ لیکن اپنے مجروح جذبات کو سینے میں دفن کر کے اس نے ڈھٹائی سے ایک بار پھر للنیٰ سے ملنے کے لیے کوشش کی۔

"زیادہ بک بک نہیں کرو۔ چلی جاؤ یہاں سے ورنہ" وسیم ہانپ گیا۔

"اچھا —" وہ بڑے پُرسکون انداز میں اٹھی۔ اس نے چادر کے کونے سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ "تم منت سماجت سے نہیں مانتے تمھاری مرضی — لیکن میں بچی سے مل کر رہوں گی — اسے حاصل کروں گی ہر قیمت پر۔" وہ پاگل سی دکھائی دے رہی تھی۔ وسیم نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"میں بچی کے لیے تم پر مقدمہ کر دوں گی —" وہ چیخی — "قانون میرا ساتھ دے گا — میں اسے لے کے رہوں گی —"

"قانون تمھیں بچی نہیں دے گا لیکن وسیم نہیں" اٹل اور گونجدار لہجے میں وہ بولا۔

"قانون کے آگے تمھیں جھکنا پڑے گا بچی مجھے مل جائے گی" وہ بھی اسی لہجے میں بولی۔

"جس دن قانون نے بچی تمھارے حوالے کی — اس دن دیکھا جائے گا۔ میرے لیے للنیٰ کو تم جیسی ڈائن ماں کے حوالے کرنے سے اس کا گلا گھونٹ دینا زیادہ آسان ہو گا — سمجھیں —" وہ دروازہ کھول کر تیزی سے اندر چلا گیا۔ "وسیم" اس نے سر دروازے سے پیچ دیا۔ لیکن وسیم اندر سے دروازہ بند کر چکا تھا۔

جانے کب تک وہ بند دروازے سے ٹکراتی رہی۔

شبو کی حالت ناگفتہ بہ تھی — پاگلوں کی طرح وہ گھر میں پھرتی رہی۔ کبھی وہ پُرسکون ہو کر سوچنے لگتی — کبھی مشتعل ہو کر چیخنے لگتی — نوکر چاکر سبھی حیران تھے۔ لیکن جس نے بھی بڑھ کر اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی — وہی موردِ عتاب بن گیا۔

سارا دن اس نے بے کلی سے گزارا — نواز کل کا بگڑا ہوا تھا۔ وہ شبو کے حالات و جذبات سے بے گانہ تھا — کھانے کے لیے دوپہر کو وہ گھر نہیں آیا۔

لیکن شبو کو کھانے کا ہوش ہی کہاں تھا۔

"بیگم صاحب — چائے کے دو گھونٹ ہی پی لیجئے — صبح سے کھیل تک منہ میں اڑ کر نہیں گئی —" اس کی ملازمہ نے التجا کی۔

"چلی جاؤ۔" وہ چیخی۔ ملازمہ سہم کر کمرے سے نکل گئی۔

شبو اپنے افکار سے الجھنے لگی۔

للنیٰ سے ملنے کا امکان تو کوئی نہیں رہا تھا — لیکن پھر بھی ماستا ری بلا تھی۔ وہ صرف ایک نظر اپنی بچی کو دیکھ لینا چاہتی تھی — اس کے بعد — اس کے بعد اس کے ذہن نے خاصا پروگرام ترتیب دے رکھا تھا۔

وسیم کو اس نے قانون کا سہارا لینے کا رعب دیا تھا۔ لیکن اس کا جواب کتنا دل خراش تھا۔ کہیں انتقام کی آگ میں وہ واقعی اس کی بچی کو نہ جھونک دے۔ شبو مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگی۔ اس کی دماغی نسیں تنی ہوئی تھیں

کسی بلا یہ بناؤ شدت اختیار کرکے خوف ناک صورت بھی اختیار کر سکتا تھا۔
لیکن شبو کو اپنی مطلقاً پروا نہ تھی ۔۔۔ اس کے دل و دماغ میں
ایک ہی لگن تھی۔ ایک ہی خواہش تھی۔
"اپنی بچی کو وسیم سے چھین لانے کی"
وہ تپتے ہوئے دماغ سے اس جلتی ہوئی لگن اور تڑپتی ہوئی خواہش
کو عملی رنگ دینے کے متعلق سوچنے لگی۔
اور ۔۔۔ پھر اس نے سوچ لیا ۔۔۔ وہ وسیم کے ہاں جائے گی۔ کسی
نہ کسی طرح اندر داخل ہو کر اپنی بچی کو بازوؤں میں سمیٹ کر لے بھاگے
گی ۔۔۔ وہ ہر قیمت پر مکان کے اندر داخل ہو گی ۔۔۔ ہر قیمت پر ۔۔۔
وہ اپنی سوچ کو عملی صورت دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔۔
ترکیب قابلِ عمل بھی تھی یا نہیں ۔۔۔ یہ فیصلہ کرنے کا اسے ہوش ہی نہ
تھا ۔۔۔ اک بات اس کے ذہن میں سما چکی تھی۔ اور درہم برہم ہوتے
ذہن میں لبنیٰ کو پا لینے کا سہانا خیال ہی اس کا منتہائے زندگی بن گیا تھا۔
چپکے سے اس نے کالی شال اٹھائی ۔۔۔ آہستہ سے دروازہ
کھولا۔ اور دبے پاؤں کمرے سے نکل کر پورچ میں آگئی ۔۔۔ اس کا تعاقب
کوئی نہیں کر رہا تھا ۔۔۔ لیکن پھر بھی وہ سہمے سہمے انداز میں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی
گیٹ سے نکل کر وہ سنسان سڑک پر دوڑنے لگی۔ رات کے دس
بج چکے تھے۔ وہ وقت اور ماحول سے بے نیاز تیزی سے وسیم کے
گھر کی طرف جا رہی تھی۔
جانے کتنی دیر وہ بازاروں اور گلیوں کے فاصلے ناپتی رہی۔ لیکن آخر

اس نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ کوئی جواب نہ ملا۔
اس نے دوبارہ کنڈی کھٹ کھٹائی۔ اب بھی کوئی نہ بولا۔
سنسان گلی میں کمیٹی کی بتی ٹمٹما رہی تھی ۔۔۔ فضا ٹھٹھری ہوئی تھی۔
کہیں کہیں کتے بھونک کر سناٹا توڑ رہے تھے۔
اس نے دروازہ پیٹ ڈالا ۔۔۔ ساتھ والے گھر کی بتی روشن
ہوئی۔ کسی نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔
لیکن دریں اثنا دروازہ کھل گیا تھا۔
بوڑھی ملازمہ آنکھیں ملتے ہوئے سامنے کھڑی تھی۔
شبو نے جلدی سے پٹ دھکیلا۔ اور بجلی کی تیزی کی طرح ڈیوڑھی پار کر گئی۔
چھوٹے سے صحن میں کم روشنی کا قمقمہ جل رہا تھا۔ شبو چند سیکنڈ
وہاں ٹھہری ۔۔۔ ملازمہ پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ شبو کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
شبو سامنے والے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے اک قہقہہ لگایا۔
شاید اپنی کامیابی پر ۔۔۔ کمرے تک جانے میں کوئی مزاحمت ہی نہ
ہوئی تھی۔ ملازمہ لپک کر کمرے میں آئی اور بتی جلائی۔
کمرہ روشن ہو گیا ۔۔۔ دو پلنگ اب بھی ہمیشہ کی طرح ساتھ ساتھ
بچھے تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ کھونٹی پر وسیم کا دھاریدار پاجامہ لٹک
رہا تھا۔ کونے میں شبو کے جہیز والی سنگار میز پڑی تھی ۔۔۔ لبنیٰ کے کھلونے
تیل کی شیشی اور کنگھا الٹ پلٹ پڑے تھے۔
پلنگ خالی تھے ۔۔۔ ایک پلنگ کا بستر شکن آلود تھا۔ جیسے کوئی
سو کر اٹھا ہو ۔۔۔ سرہانے بھی بے ترتیب پڑے تھے۔ میلا تولیہ بھی وہیں
لٹک رہا تھا۔ دودھ کی پیالی قریب ہی میز پر پڑی تھی۔

شبو نے کھڑے کھڑے چاروں طرف دیکھا۔ اور پھر جیسے اسے
ایک دم ہوش آ گیا۔ تیزی سے ملازمہ کی طرف بڑھی — جو دروازے کے
قریب کھڑی حیران اور مبہوت اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ — کیسے آئیں بی بی —؟"

"لبنیٰ — کہاں ہے؟"

"ہسپتال"

"کیوں؟"

"بخار تھا — آج شام بہت خطرناک حالت ہو گئی — ڈاکٹر نے
ہسپتال داخل کر لیا — شام کو صاحب اسے لے کر ہسپتال چلے گئے۔"

شبو خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی — اس کا رنگ فق تھا۔

"بیٹھ جاؤ بی بی —" ملازمہ نے آہ بھر کر کہا — "یہ گھر تو اُجڑ ہی گیا
اب جانے بچی کا کیا ہو گا!"

"وہ بیمار نہیں ہے —" شبو نے جانے کس سوچ سے اُلجھتے
ہوئے کہہ دیا۔

"ہاں بی بی — اس دن کی مار سے ڈر گئی ہے —" اور پھر ملازمہ
شبو کی حالت سے بے خبر سارا قصہ دہرانے لگی۔

"اسے ڈر ہے نا میں مقدمہ جیت لوں گی —" وہ آنکھیں پھاڑے
دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی — "وہ اسی لیے اسے مار ڈالے گا۔"

ملازمہ کچھ نہ سمجھ سکی — حیرت زدہ سی شبو کو دیکھنے لگی۔

شبو بہکی بہکی سی باتیں کرتی رہی۔

ملازمہ نے اس کا ہاتھ تھام کر پلنگ پہ بٹھا دیا — پانی کا گلاس
لا کر اسے پلایا۔

"مامتا بُری ہوتی ہے۔" وہ ہمدردی کے اظہار میں بولی۔

شبو کی آنکھیں بھر آئیں — اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ملازمہ اسے تسلی دے کر چپ کرانے لگی۔

"اللہ سے خیر مانگو بی بی — بخار ہی ہے اتر جائے گا —
رونے سے کیا ہوتا ہے — دعا کرو — اللہ اس پر اپنا فضل کرے۔"

کون جانے شبو اس کی باتیں سن بھی رہی تھی یا نہیں — وہ ایک
دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ملازمہ اس کے گھر بار کے بارے میں پوچھنے لگی۔

شبو بغیر کوئی جواب دیئے کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی — چند
لمحے وہ کچھ سوچتی رہی۔

پھر اس نے تیزی سے صحن پار کیا۔ ڈیوڑھی سے باہر گلی میں نکل آئی۔

"شبو بی بی —!" ملازمہ نے اسے پکارا۔

لیکن وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گلی طے کرنے لگی — وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کیا
کرنے جا رہی تھی — کوئی نہ جانتا تھا۔

گرتی پڑتی وہ ہسپتال پہنچ گئی — گیٹ پر چوکیدار کھڑا تھا۔ ایک بجنے
والا تھا۔ ہسپتال پہ جامد سناٹا طاری تھا — دور نزدیک برقی قمقمے ٹوٹتے
دل کی امیدوں کی طرح چمک رہے تھے — چوکیدار اک معزز عورت کو رات

کے اس سنسان سمے میں اکیلے دیکھ کر متعجب ہُوا۔

"لبنیٰ بیمار ہے ۔۔۔" اس نے چوکیدار سے کہا۔

"آپ اس وقت آئیں؟"

"تمھیں کیا" وہ غرائی "دروازہ کھولو ۔۔۔ میری بچی بیمار ہے۔"

وہ حواس باختہ سی نظر آ رہی تھی ۔۔۔ چوکیدار نے ہمدردی سے اسے دیکھا اور اندر آنے کے لیے گیٹ ذرا سا کھول کر راہ بنا دی ۔۔۔

وہ تیز قدموں سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

وہ نہ جانتی تھی۔ کہ اس کی بچی کہاں ہے ۔۔۔ لیکن اس کی مامتا اس حالت میں بھی ۔۔۔ جبکہ اس کا ذہنی نظام اُلجھ رہا تھا۔ اس کی رہبری کر رہی تھی ۔۔۔ ہسپتال میں کہیں نہ کہیں تو وہ اُسے ڈھونڈ ہی لے گی نا؟

—٭—

لبنیٰ سہ پہر سے بے ہوش تھی۔ بخار خطرناک حدود کو چھو رہا تھا۔ شام سے اسے ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے طبی سہولتیں بہم پہنچا کر ہر ممکن کوشش کی تھی ۔۔۔ لیکن اسے ہوش نہ آیا تھا۔ وقفوں کے بعد وہ امی امی چیخ اٹھتی ۔۔۔ پھر سہم کر سمٹ جاتی۔ اس کا جسم کانپنے لگتا ۔۔۔ اور پسینہ یوں بہنے لگتا ۔۔۔ جیسے کسی نے اسے پانی کے بھرے ٹب میں ڈال دیا ہو ۔۔۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ وسیم بچی کے سرہانے سٹول پر بیٹھا تھا۔ بخار کی حدت سے وہ جل رہی تھی ۔۔۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ جو ہسپتال کے سُرخ کمبل میں کچھ اور بھی سرخ نظر آ رہا تھا۔

بتی روشن تھی۔

وسیم ٹکٹکی باندھے بچی کو دیکھتا رہا ۔۔۔ پھر جھک کر اس نے بچی کی پیشانی چوم لی ۔۔۔ آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اُن کی آنکھوں سے لڑھک کر بچی کے بالوں میں جذب ہو گئے۔

بے قراری سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اسے پکارنے لگا۔

"لبنیٰ ۔۔۔ لبنیٰ ۔۔۔ میری بچی" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کئی بار پکارا۔

لیکن ۔۔۔ بے ہوشی تو جیسے ابدی نیند بنی جا رہی تھی ۔۔۔ بے تاب ہو کر اس نے اپنا سر لبنیٰ کے تکیئے پر رکھ دیا ۔۔۔ منجمد درد پگھلنے لگا۔ تڑپ طوفانی بن گئی ۔۔۔ لبنیٰ کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ اور کمرے کا جامد سناٹا اُس م

کی سسکیوں سے ٹوٹ گیا صبر کے سارے بند ٹوٹ گئے — آج اس
کے دکھ کی انتہا ہو گئی تھی۔
"میری بچی" اس نے اپنا گال اس کے جلتے رخسار سے لگا دیا۔
میں نے اپنے انتقام کی آگ میں تمھیں جلا ڈالا — تم ماں کو نہ بھلا سکیں۔
ایسے — اسے تو میں بھی نہ بھلا سکا — جس نے اس کے ساتھ پیار کا
رشتہ جوڑا تھا — تم — تم تو اس کا گوشت پوست ہو — اس کے
خون کا — حصہ ہو — میں خود غرض ہوں — میری آگ میں تم بھی جل
گئیں — میری بچی — میں ہار گیا — ہر بازی ہار گیا — تم جیت
گئیں — میری تقدیر میں شکست کے کھنڈروں کے سوا کچھ نہیں —
اندھیرے — مستقل اندھیرے — اور بس —"
اس نے سر اٹھایا — آنسو پونچھ کر لبنیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"صبح تک مہلت دے دو لبنیٰ — میں تمھیں تمھاری ماں کی جھولی میں ڈال
دوں گا — یہ آخری شکست بھی خوشی سے برداشت کر لوں گا — لبنیٰ۔
صبح تم — ماں کے پاس چلی جانا — میں اس کے ساتھ تمھاری یاد
بھی — سینے میں دفن کر لوں گا — میری تقدیر میں یہی ہو گا —"
گہری ٹھنڈی آہ بھر کر وہ اٹھا — کونے میں میز پر جگ میں پانی رکھا
تھا — اس کا حلق خشک تھا۔ پانی کے دو گھونٹ پینے کے لیے وہ کونے کی طرف گیا۔
عین اسی وقت دروازہ کھلا ——— وسیم نے پلٹ کر دیکھا۔
"کون — تم" اس کے ہونٹوں سے آواز پھسلی — اس کی
آنکھیں حیرت سے پھٹ سی گئیں۔
کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھول کر شبو اندر آ چکی تھی۔ ادھر ادھر

دیکھے بغیر وہ پنجوں کے بل چلتی لبنیٰ کے پلنگ تک پہنچی — چوروں کی
طرح اس نے جھک کر دیکھا — وسیم حیرت زدہ سا اسے دیکھ رہا تھا۔
پھر اس نے جھپٹ کر لال کمبل ایک طرف پھینکا لبنیٰ کو بازوؤں میں سمیٹا۔
اور — تیزی سے دروازے کی طرف دوڑی۔
"شبو —" وسیم چلایا — اس کے حواس جواب دیئے جا رہے
تھے لیکن شبو رکی نہیں۔ دروازہ کھول کر تیزی سے برآمدے میں نکل گئی۔
اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا — "شبو" — وسیم چیخا۔
شبو دوڑنے لگی — بچی اس کے بازوؤں میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ
قہقہے لگا رہی تھی۔ وسیم اس کے پیچھے لپکا۔
آوازیں سن کر دو نرسیں باہر نکل آئیں۔ شبو اور وسیم آگے پیچھے دوڑ
رہے تھے۔ وسیم نے شبو کو جا لیا۔
وہ زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی — بچی کو بازوؤں میں جکڑ رکھا
تھا — بچی اب تک بے ہوش تھی — وسیم بچی کو اس سے چھیننے
لگا۔ وہ ننگے فرش پر بچی کو سینے سے چمٹائے بیٹھ گئی۔
کمپوڈر — ڈاکٹر نرسیں — اور کئی مریض اس ہنگامے سے
چونک کر باہر نکل آئے — سب حیران حیران سے نظر آ رہے تھے۔
— معاملہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
وسیم ہانپتے ہوئے بچی کو اس کے بازوؤں کی آہنی گرفت سے
چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا — "دم گھٹ جائے گا بچی کا —
سانس رک جائے گی — چھوڑ دو اسے وہ بیمار ہے —
"میں لے آئی اپنی بچی کو لے آئی —" وہ قہقہے لگاتے ہوئے

کہہ رہی تھی۔ بازوؤں کی گرفت سخت تھی۔
دو نرسوں کی مدد سے وسیم نے بچی کو اس کے بازوؤں سے نکالا۔
۔۔۔سب لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے ۔۔۔ استفسار بھی کر رہے
تھے لیکن جواب دینے کا ہوش شبو کو تھا، نہ وسیم کو۔۔۔
بچی کو ہاتھوں میں لیے وسیم اٹھا۔۔۔
شبو اب بھی بینچ پر بازو سمیٹے قہقہے لگا رہی تھی۔۔۔ بچی بازوؤں
میں نہیں تھی۔۔۔ لیکن اس احساس سے وہ دور پہنچ چکی تھی۔
"میں لے آئی اپنی بچی کو لے آئی۔۔۔" وہ اسی انداز میں قہقہے لگاتے
ہوئے کہہ رہی تھی۔
"بچی تو ان کے پاس ہے۔" نرس نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔ لیکن
وہ برابر قہقہے لگائے گئی۔
"معلوم ہوتا ہے ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔" ڈاکٹر رحمان نے آگے
بڑھتے ہوئے کہا۔
نرس نے اس کے خیال کی تائید کی۔
"یہاں سے لے جائیں انھیں ۔۔۔ اور مریض جاگ جائیں گے۔
وارڈ میں نہیں لے جانا چاہیئے۔۔۔ اس طرف کمرے میں لے چلیں۔۔۔"
ڈاکٹر نے کمپوڈر سے کہا۔۔۔ اور یہ ہے کون؟ ہوا کیا کے استفساروں
کے درمیان نرسیں اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھائے گئیں۔ ان کے قہقہے تیز سے
تیز تر ہونے لگے۔ وسیم کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے اور وہ ہاتھوں پر موت وحیات کی
کشمکش سے دوچار لینی کو لیے اس سمت دیکھتا رہا جس طرف نرسیں شبو کو لے جا رہی تھیں

(رضیہ بٹ ۔۔۔ پشاور)

سلطان احمد خوشنویس۔ گجرات